Atlantis
Publications
انسپکٹر جمشید سیریز
خونی دھواں

السلام علیکم!

خونی دھواں آپ کو اس وجہ سے پسند آئے گا کہ یہ ایک بالکل مختلف ناول ہوگا۔ شروع سے آخر تک آپ شدید بے چینی میں مبتلا رہیں گے، بالکل اسی طرح جس طرح محمود، فاروق، فرزانہ اور انسپکٹر جمشید رہے...... ان کی بے چینی آپ اپنی بے چینی محسوس کریں گے اور کیوں نہ ہو، آخر آپ ان کرداروں کو اپنے پسندیدہ کردار تسلیم کرتے ہیں...... ان کے کارنامے پڑھنے کے لیے بے چین رہتے ہیں، پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ یہ بے چین ہوں اور آپ اس بے چینی کو اپنی بے چینی محسوس نہ کریں، لیکن خدانخواستہ میں یہ نہیں چاہتا کہ آپ ذرا دیر کے لیے بھی بے چین ہوں۔ یہ بے چینی تو دراصل اور ہی قسم کی ہوگی...... اسے آپ پر لطف بے چینی کا نام دے سکتے ہیں...... اب آپ کہیں گے، لیجیے، چل نکلا اس شخص کا تو دماغ...... بے چینی بھی کبھی پر لطف ہوا کرتی ہے۔

پڑھ کر دیکھ لیں اور فیصلہ کر لیں کہ ہو سکتی ہے یا نہیں......

محاوروں کا دن

انسپکٹر جمشید کو پہاڑ بہت پر اسرار لگتے تھے۔ وہ اکثر پہاڑوں کی طرف نکل آتے، انہیں گھنٹوں گھورا کرتے اور ان پر چڑھا بھی کرتے ان پر چڑھنے کا تو انہیں بہت ہی شوق تھا۔ بعض اوقات تو وہ بہت خطرناک پہاڑوں پر بھی چڑھ جاتے۔ اگرچہ اس شوق کے آگے مجبور تھے۔ محمود، فاروق، فرزانہ بھی اس شوق میں ان سے پیچھے نہیں تھے، لیکن بیگم جمشید کو پہاڑوں سے وحشت ہوتی تھی۔ پہاڑوں پر چڑھنے کا ذکر سن کر ہی اُن کا دل ہول کھانے لگتا۔ چڑھنا تو رہا در کنار اور پھر ہوا یہ کہ ایک چھٹی کے دن انسپکٹر جمشید نے پہاڑ کی سیر کا پروگرام بنا لیا، لیکن محمود، فاروق اور فرزانہ کو ساتھ لے جانے کی شرط یہ رکھی کہ انہیں اپنی امی کو بھی ساتھ چلنے پر مجبور کرنا ہوگا۔ محمود، فاروق اور فرزانہ شرط سن کر گھبرا گئے، کیونکہ جانتے تھے، یہ ایک انتہائی مشکل اور ناقابل عمل شرط ہے۔ ان کی امی اور پہاڑ کی سیر پر رضامند ہو جائیں، تقریباً ناممکن تھا، لیکن انہیں اس ناممکن کو ممکن بنانا تھا۔ ناشتے کے فوراً بعد انسپکٹر جمشید تو سیر کی تیاری میں مصروف ہو گئے اور وہ اپنی امی کے پیچھے پڑ گئے، دوسرے لفظوں میں ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ گئے۔

"پلیز امی، مان جائیے۔" فرزانہ ہاتھ جوڑ کر کہہ رہی تھی۔

"تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا۔ اگر میں پہاڑ پر سے گر پڑی تو میری ہڈی پسلی ایک ہو جائے گی، بلکہ ہڈیاں سرمہ بن جائیں گی۔" وہ بولیں۔

''امی جان یقین کیجئے، یہ محاورہ بالکل غلط ہے، ہڈیوں کا سرمہ بن ہی نہیں سکتا۔'' فاروق بول پڑا۔

''فاروق، کیا بکواس ہے یہ تم امی کو ستا رہے ہو؟'' فرزانہ نے بھنا کر کہا۔

''اوہ سوری، ہاں تو امی جان، میری پیاری امی جان، خدا کے لیے ہمارے ساتھ چلیئے۔ میں گارنٹی دیتا ہوں، آپ نہیں گریں گی ہم آپ کو ایسی جگہ چڑھنے پر مجبور نہیں کریں گے۔ جس سے گرنے کا امکان ہو۔'' محمود بولا۔

''بلکہ ہم ایسی کسی جگہ کا رُخ بھی نہیں کریں گے۔ بس آپ چلیے ہمارے ساتھ۔''

''ہرگز نہیں، میرا دماغ خراب نہیں ہوا۔''

''تو کیا امی جان آپ کے خیال میں ہمارا دماغ چل گیا ہے۔'' محمود نے بوکھلا کر کہا۔

''ہاں، اس میں کیا شک ہے۔''

''تو۔ تو کیا آپ کے خیال میں ابا جان کا بھی..... '' فرزانہ کہتے کہتے رُک گئی۔

''بدتمیز، میں نے ان کے بارے میں کب کہا ہے۔'' بیگم جمشید گھبرا کر بولیں۔

''سوری امی، اب ہمیں کیا معلوم تھا کہ آپ کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے، لیکن امی جان، خدا کے لیے ہمارا دل نہ توڑیے ورنہ ہم بے موت مر جائیں گے۔'' فاروق نے التجا کی۔

''میرا دل کہتا ہے، تم تینوں بے موت مرنے کے لیے ہرگز پیدا نہیں ہوئے۔'' بیگم جمشید مسکرائیں۔

''اوہو امی، آپ تو ہماری ہر بات کو چٹکیوں میں اڑائے دے رہی ہیں۔'' فرزانہ نے منہ بنایا۔

''تو پھر کس میں اڑاؤں۔'' بیگم جمشید بولیں۔

''امی جان، آج تو آپ کمال کر رہی ہیں۔'' فاروق نے حیران ہو کر کہا۔

''کمال، کیا مطلب؟ کیا کمال؟'' انہوں نے حیران ہو کر کہا۔

''یہ کہ ہماری ہر بات کا فوراً جواب دے ڈالتی ہیں۔''

''یہ میں نے تمہی سے سیکھا ہے۔'' وہ شوخ انداز میں مسکرائیں۔

''اُف خدا۔ آج شاید فاروق کی روح آپ میں سرایت کر گئی ہے۔'' فرزانہ بولی۔

''ارے باپ رے، تو کیا اس وقت میں بغیر روح کے ہوں۔'' فاروق نے بوکھلا کر کہا۔

''نہیں بھئی، بدلے میں امی جان کی روح تمہارے جسم میں آ چکی ہے۔'' محمود نے فوراً کہا۔

''ہاں بھئی، تمہاری کوششوں کا کیا نتیجہ نکلا؟'' اسی وقت انسپکٹر جمشید کسی ضرورت کے تحت ادھر سے گزرے، تو انہوں نے پوچھا۔

''جی نتیجہ، ابھی تو ہم روحوں کے انتقال کے چکر میں ہیں۔ نتیجہ ابھی دور ہے۔'' محمود نے منہ بنایا۔

''کیا مطلب! یہ تم نے روحوں کا انتقال کب سے شروع کر دیا۔'' انسپکٹر جمشید کے لہجے میں بلا کی حیرت در آئی۔

''اس کام کی ابتدا امی جان سے ہوئی ہے۔'' فاروق نے معصومانہ لہجے میں کہا۔

''ہائیں۔ بیگم یہ میں کیا سن رہا ہوں؟'' انسپکٹر جمشید کے منہ سے نکلا۔

''ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑا دیں، یہ تو یوں ہی ادھر کی اُدھر کی ہانک رہے ہیں۔''

''اوہ، تو یہ بات ہے۔ احمقو سنو، اگر تم یونہی ادھر ادھر کی ہانکتے رہے تو تمہاری امی تمہیں چٹکیوں میں اڑا دیں گی۔'' انسپکٹر جمشید مسکرا کر بولے۔

''شاید آج پہاڑ کی سیر کا دن نہیں ہے۔'' فاروق بے چارگی کے عالم میں بولا۔

''تو پھر کس چیز کا دن ہے؟''

''محاوروں کا۔'' اس نے کہا اور بیگم جمشید کی ہنسی نکل گئی۔ محمود، فرزانہ اور انسپکٹر جمشید بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔

''اچھا بھئی تمہاری تم ہی جانو: بہر حال میرا فیصلہ اٹل ہے۔ اگر تم اپنی امی کو پہاڑ کی سیر کے لیے آمادہ نہ کر سکے۔ تو سیر کا پروگرام کینسل۔''

''آخر آپ مجھے کیوں گھسیٹنا چاہتے ہیں؟'' بیگم جمشید بُرا سا منہ بنا کر بولیں۔

''میں چاہتا ہوں، تم کم از کم زندگی میں ایک بار ضرور پہاڑ کی سیر کر لو۔''

''مان جائیے، مجھے نہ لے جائیے، میں گر وِر پڑی تو نئی مصیبت گلے پڑے گی۔'' بیگم جمشید نے انہیں سمجھانے کی غرض سے کہا۔

''پروا نہیں، مصیبتیں تو روز ہی گلے پڑتی رہتی ہیں۔ ایک یہ بھی سہی۔'' وہ مسکرائے۔

''گویا آپ چاہتے ہیں، میں گر پڑوں؟''

''ہر گز نہیں، میں نے تو ایسا کبھی خواب میں بھی نہیں چاہا۔'' انہوں نے شوخ لہجے میں کہا۔ محمود، فاروق اور فرزانہ بے ساختہ مسکرا دیے۔

''توبہ ہے تم تینوں سے اور آپ سے بھی، اچھا میں چلنے کے لیے تیار ہوں، لیکن میری بھی ایک شرط ہے۔''

''امی جان۔'' محمود نے بلند آواز میں کہا۔

''زندہ باد۔'' فاروق، فرزانہ اور انسپکٹر جمشید نے ایک ساتھ بلند آواز میں کہا۔

''اور آپ کی شرط کیا ہے!'' محمود نے پوچھا۔

''یہ کہ آج کے بعد مجھے پہاڑ پر جانے کے لیے مجبور نہیں کیا جائے گا۔''

''مجھے منظور ہے۔'' انسپکٹر جمشید نے فوراً کہا۔

''ہمیں بھی منظور ہے۔'' تینوں نے پھر نعرہ لگانے والے انداز میں کہا۔

فوراً ہی دروازے کی گھنٹی بجی۔ محمود نے دروازہ کھولا تو بیگم شیرازی حیران پریشان کھڑی نظر آئیں۔

''ارے آنٹی آپ، آئیے نا۔'' محمود خوش ہو کر بولا۔

''میں آپ لوگوں کے نعرے سن کر آ رہی ہوں۔ کیا آپ لوگوں نے آج جلسے کا پروگرام بنا رکھا ہے، یا پھر کسی جلسے جلوس کی ریہرسل کر رہے ہیں۔''

اور ان کے منہ سے قہقہہ نکل پڑا۔ جلدی جلدی انہیں اصل بات بتائی گئی۔ بیگم شیرازی مسکراتی ہوئی چلی گئیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ جیپ میں سوار پہاڑ کا رخ کر رہے تھے۔ جیپ میں کھانے پینے کا بھی بہت سا سامان تھا۔ پہاڑ کے دامن میں تفریح کے لیے آنے والوں کے لیے طرح طرح کی دکانیں کھلی ہوئی تھیں۔ چھٹی کا دن گزارنے کے لیے اکثر گھرانے ادھر کا رخ کرتے تھے۔ اکثر جگہوں پر پہاڑ پر چڑھنا بہت آسان تھا، اتنا کہ چھوٹے چھوٹے بچے بھی چڑھ جاتے تھے لیکن بے شمار مقامات ایسے بھی تھے جن پر دل گردے والے لوگ ہی جایا کرتے تھے۔ گھاس کے ایک خوش نما قطعے پر بیٹھ کر پہلے انہوں نے کچھ کھایا پیا، پھر پہاڑ پر چڑھنے کے لیے تیار ہو گئے۔ اس موقعے پر بیگم جشید پھر گھبرائیں اور بولیں:

''میں پھر کہتی ہوں، آپ لوگ اوپر ہو آئیں، میں یہیں آپ کا انتظار کروں گی۔''

''یہ شرط کی خلاف ورزی ہو گی بیگم۔ دیکھو ننھے بچے بھی چڑھ رہے ہیں۔''

آخر بیگم جمشید کو ان کا ساتھ دینا پڑا۔ احتیاط کے طور پر انسپکٹر جمشید نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ فاروق سب سے آگے تھا۔ اس کے پیچھے محمود اور پھر فرزانہ۔ انسپکٹر

جمشید سب سے پیچھے تھے، کیوں کہ انہیں بیگم کو ساتھ لے کر چلنا پڑ رہا تھا۔

''واہ کتنے پر اسرار ہیں یہ پہاڑ۔ یوں لگتا ہے جیسے صدیوں کی داستانیں اپنے سینے میں چھپائے ہوں۔'' فرزانہ نے دور دور تک دیکھتے ہوئے کہا۔

''پہاڑ کا سینہ لو اور سنو۔'' فاروق بولا۔

''اب ہمیں اور آگے نہیں جانا چاہئے۔'' بیگم جمشید نے گھبرا کر کہا۔

''ڈرو نہیں، بیگم میں نے تمہارا ہاتھ پکڑ تو رکھا ہے۔''

''اور ابھی آئے ہی کتنی اونچائی پر ہیں۔'' فاروق نے کہا۔

''خدا تم سے سمجھے، تم اسے اونچائی ہی نہیں سمجھتے۔'' بیگم جمشید نے نیچے دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ کانپ سی گئیں۔ انہیں یوں لگا۔ جیسے ان کے پیروں تلے سے پہاڑ نکلا جا رہا ہو؛ تاہم انہوں نے فوراً آنکھیں بند کر کے خود کو سنبھالا اور اوپر دیکھنے لگیں۔

اب وہ اتنی اونچائی پر آ گئے تھے کہ ان سے آگے کوئی نہیں تھا۔ سیر کے لیے آنے والے سب لوگ پیچھے رہ گئے تھے اور انہیں حسرت بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ادھر بیگم جمشید کا بُرا حال تھا۔ رہ رہ کر ان کا حوصلہ جواب دے رہا تھا۔ وہ اوپر چڑھنے کی بجائے واپس نیچے اترنے کے خیال سے پریشان ہو رہی تھیں، جب کہ محمود، فاروق اور فرزانہ کا یہ حال تھا کہ بغیر کسی خوف اور جھجک کے آگے بڑھ رہے تھے۔ اور پھر وہ ایک چوٹی پر پہنچ گئے۔ دوسرے لوگ اب انہیں بہت دور اور چھوٹے چھوٹے نظر آ رہے تھے۔ وہ انہیں بہت پیچھے چھوڑ آئے تھے۔

''ہم کچھ دیر یہاں بیٹھیں گے اور پھر دوسری طرف سے نیچے اتریں گے۔'' انسپکٹر جمشید بولے۔

''لیکن اس طرف تو کوئی بھی نہیں ہے۔'' بیگم جمشید پریشان ہو کر بولیں۔

''تو کیا ہوا، میں جانتا ہوں، نیچے اتر کر ہمیں ایک لمبا چکر کاٹنا پڑے گا،

تب کہیں جا کر ہم جیپ تک پہنچیں گے، لیکن ہم تمہارے ساتھ ہیں تو پھر تمہیں ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔''

''اچھی بات ہے، نہیں ڈرتی۔'' انہوں نے مسکرا کر کہا۔

''ویری گڈ، یہ ہوئی نا بات۔'' انہوں نے خوش ہو کر کہا۔

''امی جان، آپ تو جیرال جیسے مجرم سے بھڑ گئی تھیں اور اسے نیچا مارا تھا۔ کمال ہے، آپ پہاڑ سے ڈرتی ہیں۔'' فرزانہ نے کہا۔

''بات یہ نہیں ہے بیٹی، بعض لوگوں کے ذہنوں پر کچھ خاص چیز کا خوف اپنا سکہ جما لیتا ہے۔ مثلاً کچھ لوگ پانی سے بہت ڈرتے ہیں، وہ تیرنے کا خیال بھی دل میں نہیں لا سکتے۔ اسی طرح کچھ لوگ کتوں سے بہت ڈرتے ہیں اور ان کے سائے سے بھی خوف زدہ ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح بہت سے لوگ کچھ خاص چیزوں سے ڈرتے ہیں۔ اس میں عجیب بات کیا ہے۔'' انہوں نے وضاحت کی۔

''جواب تو تم نے بہت معقول دیا بیگم۔'' انسپکٹر جمشید نے ان کی تعریف کی۔

کچھ دیر بیٹھ کر وہ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ انسپکٹر جمشید نے پھر بیگم کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اب بھی فاروق سب سے آگے چلا۔ ترتیب وہی رہی۔

''کتنا لطف آ رہا ہے۔'' محمود نے خوش ہو کر کہا۔

''ہاں، کاش ہم انکل خان رحمان اور پروفیسر انکل کو بھی ساتھ لائے ہوتے۔'' فرزانہ نے سرد آہ بھری۔

''میں نے بھی ان کے بارے میں سوچا تھا، لیکن کیا کیا جائے، خان رحمان تو ان دنوں اپنی زمینوں پر گئے ہوئے ہیں اور پروفیسر داؤد ایک سائنس کانفرنس میں شرکت کی غرض سے ملک سے باہر ہیں۔''

''خیر کوئی بات نہیں۔ آئندہ جب بھی پہاڑ کی سیر کا پروگرام بنا، ان لوگوں کو

ضرور شامل کریں گے۔" محمود نے کہا۔

"خدا کا شکر ہے، اس وقت میں آپ لوگوں کے ساتھ نہیں آؤں گی۔" بیگم جمشید خوش ہو کر بولیں۔

"کاش ہم آپ کی شرط نہ مانتے۔" فرزانہ نے پھر سرد آہ بھری۔

"آج کہیں تم ناشتے میں کاش اور سرد آہیں تو نہیں کھاتی رہیں۔" فاروق نے جل کر کہا۔

"تو تمہیں۔"

اچانک بیگم جمشید کے منہ سے نکلنے والی چیخ نے فرزانہ کے الفاظ کا گلا گھونٹ دیا۔ انہوں نے بوکھلا کر دیکھا۔ ان کی امی کا پاؤں پھسل گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی انسپکٹر جمشید کے جسم کو زوردار جھٹکا لگا تھا اور اس طرح دونوں توازن برقرار نہ رکھ سکے تھے۔ اب صورت حال یہ تھی کہ بیگم جمشید کا جسم پہاڑ کے ساتھ نیچے کی طرف لٹکا ہوا تھا اور انسپکٹر جمشید کا سر نیچے اور ٹانگیں اوپر تھیں۔ ایسی حالت میں ان کا ایک ہاتھ بیگم کے ہاتھ کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھے۔ بیگم جمشید کے دونوں پاؤں خلا میں لٹک رہے تھے۔ انہوں نے انسپکٹر جمشید کو چلاتے سنا:

"بیگم تمہارا ہاتھ پھسل رہا ہے۔ دوسرے ہاتھ کا سہارا لینے کی کوشش کرو۔ محمود، فاروق، فرزانہ دوڑو۔"

تینوں ان کے پکارنے سے پہلے ہی ان کی طرف دوڑ پڑے تھے، لیکن اس سے پہلے کہ وہ نزدیک پہنچنے میں کامیاب ہوتے بیگم جمشید کا ہاتھ انسپکٹر جمشید کے ہاتھ سے نکل گیا۔ ساتھ ہی ان کے منہ سے ایک بھیانک چیخ نکل گئی۔ انسپکٹر جمشید پوری قوت سے چلائے۔ "بیگم۔"

ان کی آواز پہاڑوں نے پورے زور شور سے دہرائی۔ انہوں نے پتھرائی

ہوئی آنکھوں سے نیچے دیکھا، بیگم جمشید لڑھکتی چلی جارہی تھیں۔ انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، نیچے کی طرف دوڑ پڑے۔ اس طرح دوڑنا اگرچہ موت کو دعوت دینے کے برابر تھا، لیکن اس کے باوجود وہ دوڑ رہے تھے۔ انسپکٹر جمشید کی رفتار ان تینوں سے زیادہ تھی اور وہ سب سے آگے تھے، لیکن بیگم جمشید کے گرنے کی رفتار کا ساتھ وہ بھی نہیں دے پا رہے تھے، کیونکہ وہ اپنے پیروں پر نہیں جسم کے بل نیچے جارہی تھیں۔ انہیں اپنے دل ڈوبتے محسوس ہو رہے تھے اور پھر ان کے دم گویا لبوں پر آ کر اٹک گئے، آنکھیں پتھرا گئیں۔ بیگم جمشید لڑھکتے لڑھکتے ایک چٹان پر پہنچ گئی تھیں۔ اور اس چٹان کے نیچے گہری کھائی تھی۔ انہوں نے خوف سے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور دل ہی دل میں خدا کو یاد کرنے لگے۔ ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں تو بیگم جمشید چٹان پر نہیں تھیں۔

"امی جان۔" محمود، فاروق اور فرزانہ ایک ساتھ حلق پھاڑ کر چلائے۔

"نہیں نہیں، بیگم۔ یہ نہیں ہو سکتا۔" انسپکٹر جمشید نے رندھی آواز میں کہا اور ایک بار پھر نیچے کی طرف دوڑنے لگے۔ تینوں ان کے پیچھے چلے۔ ان کی آنکھوں میں بار بار آنسو آ رہے تھے اور ان آنسوؤں کی موجودگی میں نیچے اترنا اور مشکل ہو گیا تھا۔ کیونکہ راستہ صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔ لیکن ان آنسوؤں پر ان کا بس نہیں تھا۔

کسی نہ کسی طرح وہ کھائی تک پہنچے۔ کھائی سے پہلے ایک پختہ سڑک انہیں نظر آئی۔ انہوں نے سڑک کا جائزہ لیا۔ کھائی میں گرنے سے پہلے بیگم جمشید سڑک پر گری ہوں گی اور پھر وہاں سے لڑھک کر کھائی میں گر سکتی تھیں۔ سڑک پر وہ کہیں بھی نظر نہ آئیں۔ آخر انہوں نے کھائی کا رخ کیا۔

لیکن کھائی میں بھی بیگم جمشید کہیں نہیں تھیں۔ خدا جانے انہیں زمین نگل گئی تھی یا آسمان کھا گیا تھا۔

☆☆☆

ٹرک کی تلاش

چند لمحے تک وہ سکتے کے عالم میں کھڑے رہے، پھر پاگلوں کی طرح کھائی میں دوڑتے پھرے، لیکن بیگم جشید کا کہیں کوئی نشان نہ ملا، نہ ان کا دوپٹہ نظر آیا، نہ کوئی جوتی، نہ خون کا کوئی دھبہ ایک بار پھر وہ شدید پریشانی کے عالم میں کھڑے ہوئے۔ ایسے میں انسپکٹر جمشید کھوئے کھوئے لہجے میں بولے:

''میں نے۔ میں نے بالکل غلط کہا تھا، یا خدا مجھے معاف فرما۔''

''کیا مطلب؟ آپ نے کیا کہا تھا ابا جان۔'' فرزانہ نے حیران ہو کر کہا۔

''تھوڑی دیر پہلے جب تمہاری امی ڈر رہی تھیں تو میں نے ان سے کہا تھا، جب ہم تمہارے ساتھ ہیں تو تمہیں ڈرنے کی کیا ضرورت؛ حالانکہ اس وقت مجھے یہ کہنا چاہیے تھا کہ جب خدا ہمارے ساتھ ہے تو پھر تمہیں ڈرنے کی کیا ضرورت؟''

''آپ آپ ٹھیک کہتے ہیں ابا جان۔'' فرزانہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''خدا مجھے معاف کرے، لیکن سوال یہ ہے کہ بیگم کہاں چلی گئیں۔ خدانخواستہ اگر وہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی ہیں تو ان کی لاش کو یہیں کہیں ہونا چاہیے۔''

''نہیں نہیں ابا جان، یہ نہ کہیے۔'' فرزانہ نے کانپ کر کہا۔

''دیکھو بھئی، اس دنیا کا ہر انسان فانی ہے۔ اسے ایک نہ ایک دن آخر مرنا ہے۔ موت سے کون انکار کر سکتا ہے؛ لہٰذا اگر بیگم کی موت آج کے دن لکھی تھی تو میں اور تم بے بس ہیں اور اگر ان کی موت کا دن آج کا دن نہیں ہے تو پھر وہ ضرور زندہ ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ ہیں کہاں؟''

اس سوال نے انہیں پریشان بھی کر دیا اور پُر امید بھی بیگم جشید کی گمشدگی پر اسرار بھی تھی اور حد درجے عجیب بھی۔ انہوں نے ایک بار پھر کھائی کا چپا چپا دیکھ ڈالا۔ کھائی میں کچھ پہاڑی لوگوں کے گھر بھی تھے۔ انہوں نے ان گھروں کے دروازے بھی کھلوا کر ان کے بارے میں دریافت کیا، لیکن کہیں سے کوئی امید افزا جواب نہ ملا۔

''ہم کھائی کا جائزہ بہت اچھی طرح لے چکے ہیں اور میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ کھائی میں نہیں گریں۔ آخر انسپکٹر جمشید بولے۔ اس بار ان کی آواز زندگی سے بھرپور تھی۔

''تو پھر؟'' محمود کے منہ سے نکلا۔

''جس جگہ سے وہ گری تھیں، وہاں سے وہ سیدھی سڑک پر آئی ہوں گی۔ سڑک پر لڑھکنے کے بعد ہی وہ کھائی میں گر سکتی تھیں، لیکن کھائی میں ان کے گرنے کے کوئی آثار نہیں ہیں۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ سڑک پر گرنے کے بعد کھائی میں ہرگز نہیں گریں۔''

''لیکن ابا جان، سڑک بھی تو ہم دیکھ چکے ہیں۔''

''آؤ ایک بار پھر سڑک کا جائزہ لیں۔''

وہ دوبارہ سڑک پر آئے۔ انہوں نے سڑک کے ایک ایک چپے کا جائزہ لیا۔ دور دور تک دیکھتے چلے گئے، لیکن ان کی مایوسی ہر لمحے بڑھتی ہی چلی گئی، کیونکہ ان

کے سڑک پر گرنے کا بھی سراغ نہیں لگ سکا تھا۔

''خدایا، آخر بیگم کہاں چلی گئیں؟'' انسپکٹر جمشید بڑبڑائے۔ محمود فاروق اور فرزانہ خلا میں گھور رہے تھے۔ ان کی آنکھیں پلکیں تک جھپکنا بھول گئی تھیں۔ تھک ہار کر وہ پھر سڑک پر اس جگہ آ کر کھڑے ہو گئے جہاں ان کے خیال کے مطابق بیگم جمشید گر سکتی تھیں۔ ابھی آ کر کھڑے ہوئے ہی تھے کہ مخالف سمت سے ایک ٹرک آتا دکھائی دیا۔ ٹرک کو دیکھ کر انسپکٹر جمشید چونک اٹھے۔ پھر ان کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی۔ اس چمک میں امید کی کرن بھی تھی۔ پھر جوں ہی ٹرک نزدیک آیا۔ انہوں نے ہاتھ کا اشارہ دے دیا۔ ٹرک ڈرائیور نے انہیں حیران ہو کر دیکھا اور پھر بریک لگاتے ہوئے، سر کھڑکی سے باہر نکالتے ہوئے بولا:

''کیا بات ہے صاحب، ٹرک میں کوئی جگہ نہیں ہے۔''

''ہمیں لفٹ نہیں چاہیے بھئی، صرف یہ معلوم کرنا ہے کہ کیا آپ کے ٹرک سے آگے بھی کوئی ٹرک گیا ہے۔''

''ہاں، ہمارے ٹرک سے آگے ایک اور ٹرک تھا۔ درمیانی فاصلہ دو تین میل ہو گا۔ شہر میں ریلوے کراسنگ پر میں نے اُسے دیکھا تھا۔ میں چائے پینے کے لیے رک گیا تھا؛ ورنہ اس وقت ہم ساتھ ساتھ ہوتے۔'' ڈرائیور نے کہا۔

''اس ٹرک کے کسی اور طرف مڑنے کا تو کوئی امکان نہیں۔'' انہوں نے دھک دھک کرتے دل کے ساتھ پوچھا۔

''کیا بات کرتے ہیں صاحب، اس سڑک سے تو کوئی دوسری سڑک نکلتی ہی نہیں۔ جب تک کہ ہم بالکل نیچے نہ پہنچ جائیں۔'' ڈرائیور نے کہا۔

''بہت بہت شکریہ جناب، کیا آپ اس ٹرک کا نمبر بتا سکتے ہیں۔''

''میں نے نمبر پر دھیان نہیں دیا۔ ویسے بات کیا ہے؟''

''ہمارے ایک ساتھی کا اوپر سے پاؤں پھسل گیا تھا، وہ لڑھک کر نیچے آ رہا۔ ہم اسے دور دور تک تلاش کر چکے ہیں، لیکن اس کا جسم کہیں بھی نہیں ملا۔''

''تب پھر آپ کا خیال ٹھیک ہے۔ قدرت نے اسے ضرور اس ٹرک میں گرا دیا۔ وہ بڑی قدرت والا ہے، جسے وہ بچانا چاہے اسے کوئی نہیں مار سکتا۔'' اس نے کہا۔

''آپ کا خیال ٹھیک ہے، لیکن خان صاحب، اگر ہم یہاں سے اپنی جیپ لینے کے لیے گئے تو بہت دیر ہو جائے گی۔ وہ ٹرک نہ جانے کس طرف نکل جائے۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ ہمیں ٹرک پر سوار کرا لیں اور ذرا رفتار بڑھا دیں۔ شاید اس طرح ہم اس ٹرک کو پکڑ سکتے ہیں۔ آپ چاہیں تو ہم آپ کو اس کام کے لیے معقول معاوضہ دے سکتے ہیں۔''

''جناب، ہم نیکیوں کا معاوضہ اپنے اللہ سے لیا کرتے ہیں۔ آپ میں سے دو میرے ساتھ بیٹھ جائیں اور باقی دو پچھلے حصے میں بیٹھ جائیں۔''

''بہت بہت شکریہ خان صاحب۔'' انسپکٹر جمشید بولے اور فرزانہ کے ساتھ آگے بیٹھ گئے۔ محمود اور فاروق جلدی جلدی پیچھے سوار ہو گئے اور ٹرک چل پڑا۔ اب ان کے دل اور بھی تیزی سے دھڑک رہے تھے۔

ٹرک ڈرائیور رفتار بڑھانے لگا، لیکن سڑک پہاڑی تھی اور اس کے ایک طرف گہری کھائیاں تھی، دوسری طرف پہاڑ۔ ان حالات میں تیز ڈرائیونگ بہت خطرناک ہوا کرتی ہے، لیکن وہ شخص انسانی ہمدردی کے جذبات سے خالی نہیں تھا، وہ ان کی پریشانی محسوس کر رہا تھا۔ اس لیے کوشش کر رہا تھا کہ کسی طرح اس ٹرک تک پہنچ جائے، لیکن شہر پہنچنے تک اس ٹرک کا نام و نشان تک نظر نہ آیا۔

اس سڑک سے کوئی دوسری سڑک بھی کسی سمت میں نہیں مڑی تھی۔ شہر کے

سرے پر پہنچ کر ٹرک ڈرائیور نے مایوسانہ لہجے میں کہا:

''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس ٹرک کا ڈرائیور بھی تیز ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ میں اسے پکڑ نہیں سکا۔ اب شہر میں تو ہر طرف ٹرک ہی ٹرک دکھائی دیں گے۔ اب آپ اسے کس طرح تلاش کریں گے؟''

''مسئلہ واقعی پریشان کن ہے۔ خیر آپ نے ہمارا بہت ساتھ دیا اور خلوص دل سے مدد کی۔ ہم آپ کے احسان مند ہیں۔ ہم ٹرک کی تلاش میں شہر کا کونا کونا چھان ماریں گے، آپ فکر نہ کریں۔''

اس نے ٹرک روک دیا اور وہ نیچے اتر آئے۔ انسپکٹر جمشید کو کچھ خیال آیا۔ انہوں نے پوچھا۔

''کیا آپ بتا سکتے ہیں اس ٹرک میں کیا لدا ہوا تھا اور اس پر رنگ و روغن کس قسم کا کیا گیا تھا۔''

''اس پر سرخ اور نیلا رنگ کیا گیا تھا اور جہاں تک میرا خیال ہے اس میں روئی کی گانٹھیں لدی ہوئی تھیں۔'' اس نے جواب دیا۔ کیا رنگ کے بارے میں آپ یقین سے کہہ سکتے ہیں۔'' انہوں نے پوچھا۔

''ہاں، اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ سرخ اور نیلے رنگ کا ٹرک تھا۔''

''بہت بہت شکریہ، اس بات سے ہمیں مدد ملے گی۔ ذرا ٹھہریے۔ آپ نے ہماری بہت مدد کی ہے۔ نیکی کا بدلہ تو آپ خدا سے لینے کے روادار ہیں، لیکن ہمارا بھی کچھ فرض بنتا ہے۔ میں جانتا ہوں، آپ جیسے لوگ نقدی کی صورت میں کچھ قبول نہیں کرتے۔ آپ یہ میرا کارڈ رکھ لیں۔ شہر میں اگر میرے لائق کبھی کوئی کام محسوس ہو تو بلا تکلف آ سکتے ہیں۔ اس پر دفتر کا پتا بھی درج ہے اور گھر کا بھی۔ اور آپ کا نام کیا ہے؟''

''شکریہ، اگرچہ اس کی ضرورت نہیں، پھر بھی میں اسے رکھ لیتا ہوں کہ آپ کو رنج محسوس نہ ہو۔ مجھے محمد شفیع کہتے ہیں۔''

عین اسی وقت ایک ٹیکسی ان کے پاس سے گزری اور وہ جلدی سے اسے روک کر اس میں بیٹھ گئے۔ انہوں نے مڑ کر ٹرک ڈرائیور کی طرف دیکھا، وہ حیرت زدہ انداز میں کارڈ کو گھور رہا تھا۔

☆☆

ایک میڈیکل سٹور کے سامنے انسپکٹر جمشید نے ٹیکسی رکوائی۔ وہاں سے اکرام کو فون کیا، اسے حادثے کے بارے میں بتایا۔ ٹرک کے بارے میں بتایا اور ٹرک کی تلاش وسیع سے وسیع تر کرنے کی ہدایات دینے کے بعد کہا۔

''ویسے اس کی آسان ترین ترکیب یہ ہے کہ تمام گڈز ٹرانسپورٹ کمپنیوں سے یہ معلوم کیا جائے کہ ان کے ٹرکوں کا رنگ کیسا ہے، اور حادثے کے وقت پہاڑی سڑک پر اس کمپنی کا کون سا ٹرک کس سمت میں روانہ ہوا تھا۔''

''جی بہتر، آپ فکر نہ کریں۔ میرا پورا عملہ اسی وقت حرکت میں آ رہا ہے اور میں تمام پولیس سٹیشنوں کو بھی خبردار کیے دیتا ہوں۔'' اکرام نے فکرمندانہ لہجے میں کہا اور انہوں نے ریسیور رکھ دیا۔ دکان کے مالک کو کال کے پیسے دینے چاہے، لیکن اس نے پیسے لینے سے انکار کر دیا۔ آخر وہ واپس ٹیکسی میں آ بیٹھے اور ڈرائیور سے بولے:

''آپ کسی گڈز ٹرانسپورٹ کمپنی کے دفتر سے واقف ہیں؟''

''شہر میں کئی جگہ ان گڈز ٹرانسپورٹ کے اڈوں کے دفاتر ہیں۔'' اس نے کہا۔

''تو پھر کسی ایسی جگہ چلیے۔'' انہوں نے کہا اور ٹیکسی چل پڑی۔ تھوڑی دیر بعد وہ ایک کمپنی کے دفتر میں داخل ہو رہے تھے۔ جلد ہی انہیں منیجر تک پہنچا دیا گیا۔

انسپکٹر جمشید نے اپنا کارڈ اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا:

''آپ کی کمپنی کے ٹرکوں کا رنگ کیا ہے؟''

''سفید اور زرد۔'' اس نے کسی قدر پریشان ہو کر کہا۔

''سرخ اور نیلا رنگ کس کمپنی کے رنگ ہیں۔'' انہوں نے پوچھا۔

''سرخ اور نیلا رنگ۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے کوئی کمپنی اپنے ٹرکوں پر سرخ اور نیلا رنگ استعمال نہیں کرتی۔'' اس نے کہا۔

''کیا آپ یہ بات یقین سے کہہ سکتے ہیں؟''

''جی نہیں، یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی غیر معروف کمپنی اس رنگ کے ٹرک چلا رہی ہو۔ آپ کچھ اور کمپنیوں کے منیجروں سے بھی معلوم کر لیں۔''

''اچھی بات ہے، میں یہی کروں گا۔'' یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

تھوڑی دیر بعد وہ ایک اور کمپنی کے منیجر سے باتیں کر رہے تھے۔ اس نے بھی یہی بتایا کہ سرخ اور نیلا رنگ کوئی کمپنی اپنے ٹرکوں پر استعمال نہیں کرتی۔ ایک تیسرے منیجر نے ان سے کہا:

''تو وہ ٹرک کسی پرائیوٹ ادارے کا رہا ہوگا۔ آخر پرائیوٹ ادارے بھی تو ضرورت کے لیے ٹرک خرید لیتے ہیں، ظاہر ہے وہ اپنی پسند کا رنگ ٹرک پر کرائیں گے۔''

''اوہ، ضرور یہی بات ہے۔'' انسپکٹر جمشید بولے۔

شہر بھر کی ٹرکوں کی کمپنیوں کے ذمے دار لوگوں سے ملاقات کرنے کے بعد آخر کار وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ وہ ٹرک کسی پرائیوٹ فرم کا تھا۔ اس کے ساتھ ہی انسپکٹر جمشید کو ایک بات یاد آئی ٹرک ڈرائیور نے بتایا تھا کہ سرخ اور نیلے رنگ والے ٹرک پر روئی کی گانٹھیں لدی ہوئی تھیں۔ انہوں نے فوراً اکرام کو فون کیا اور بولے:

''ہیلو اکرام، کیا رہا؟''

''تلاش جاری ہے۔ سرخ اور نیلا ٹرک کسی ٹرانسپورٹ کمپنی کا ثابت نہیں ہو سکا، لہٰذا اب پرائیوٹ اداروں سے ٹرکوں کو چیک کیا جا رہا ہے۔'' اکرام نے ادھر سے جواب دیا۔

''بہت خوب، ہم بھی اسی نتیجے پر پہنچے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ سرخ اور نیلے رنگ والے ٹرک پر روئی کی گانٹھیں لدی ہوئی تھیں؛ لہٰذا ایسی فرموں کے نام معلوم کرو، جو روئی کا کاروبار کرتی ہیں۔ یا روئی سے کوئی چیز تیار کرتی ہیں۔''

''بہت بہتر، آپ نے اچھا کیا کہ بتا دیا۔ میں ابھی وائرلیس پر ہدایات دیے دیتا ہوں۔''

''اور ہم بھی تلاش میں نکلتے ہیں۔'' یہ کہہ کر انسپکٹر جمشید تینوں کو لے کر پھر ٹیکسی میں سوار ہو گئے۔ محمود، فاروق اور فرزانہ کا حال بہت برا تھا۔ وہ کسی طرح خود کو سنبھال نہیں پا رہے تھے، جب کہ انسپکٹر جمشید خود کو سنبھالے ہوئے تھے۔ ان کے لٹکے ہوئے چہرے دیکھ کر وہ بولے:

''دیکھو بھئی، تم جانتے ہی ہو، مایوسی گناہ ہے۔ اللہ کی ذات سے امید رکھو۔''

''ابا جان، کیا آپ نے ایک بات محسوس نہیں کی؟'' فرزانہ نے اداس لہجے میں کہا۔

''کون سی بات؟''

''یہ کہ اگر امی جان چٹان سے گرنے کے بعد سڑک کی بجائے اس ٹرک پر آ گری تھیں تو ٹرک والوں نے انہیں گھر تک کیوں نہیں پہنچایا، یا اگر وہ بے ہوش تھیں تو انہوں نے انہیں کسی ہسپتال تک کیوں نہیں پہنچایا۔''

''بات تو معقول ہے، لیکن ہو سکتا ہے کہ انہوں نے انہیں بے ہوش پا کر کسی ہسپتال تک پہنچا دیا ہو۔ ظاہر ہے وہ ہوش میں آنے کے بعد ہمیں فون کرنے کی کوشش کریں گی، ہمارے گھر میں نہ ملنے پر وہ یا تو بیگم شیرازی کو اپنے بارے میں اطلاع دیں گی یا پھر اکرام کو۔ اکرام سے تو ہم ابھی ابھی فون پر بات کر چکے ہیں۔ بیگم شیرازی سے پوچھ لیتے ہیں اور پھر ہسپتالوں کا چکر لگانا شروع کریں گے۔ سب سے پہلے ہم پہاڑی علاقے سے نزدیک ترین ہسپتال کو چیک کریں گے۔''

انہوں نے اس پروگرام پر عمل کیا۔ بیگم شیرازی کو کسی نے فون نہیں کیا تھا۔ انہوں نے احتیاطاً اکرام کو بھی فون کیا لیکن بیگم جمشید نے اسے بھی فون نہیں کیا تھا۔ اب وہ اس کے سوا کچھ نہیں کر سکتے تھے کہ خود ہسپتالوں کی خاک چھاننا شروع کریں۔ اتنی دیر گزرنے کے بعد بھی امید کی کوئی کرن نہیں چمکی تھی۔ اور انسپکٹر جمشید اس صورت حال سے بہت پریشان تھے، لیکن وہ اپنی پریشانی کسی نہ کسی طرح محمود، فاروق اور فرزانہ سے چھپائے ہوئے تھے، تاکہ ان کے صبر کا پیمانہ لبریز نہ ہو جائے۔

پہاڑ سے نزدیک ایک پرائیوٹ ہسپتال تھا اور یہ اسی غرض سے بنایا گیا تھا کہ سیر کے لیے آنے والے اگر کسی حادثے کا شکار ہو جائیں تو وہ ادھر کا رخ کریں۔ نہ کہ شہر تک جانے کا خطرہ مول لیں۔ اس ہسپتال کے شعبۂ حادثات سے انہیں معلوم ہوا کہ وہاں کوئی بے ہوش یا ہوش مند زخمی عورت آج کی تاریخ میں داخل نہیں کرائی گئی۔ اب مایوسی ان پر بار بار حملہ کرنے لگی؛ تاہم وہ خود کو اس کے حملوں سے بچاتے رہے اور ہسپتالوں کی خاک چھانتے رہے۔ یہاں تک کہ ایک ایک کر کے انہوں نے سبھی ہسپتال دیکھ ڈالے۔ بہت سے ہسپتالوں سے انہیں یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ سوالات کچھ اور لوگ بھی کر چکے ہیں، جس سے معلوم ہوا کہ شہر میں بیگم جمشید کی تلاش کافی تیزی سے جاری ہے۔

''فرزانہ، اگر تمہاری امی کو اس ٹرک والوں نے کسی ہسپتال تک کیوں نہیں پہنچایا۔ کسی پولیس سٹیشن کو کیوں خبردار نہیں کیا۔ تمہارا ذہن اس کا کیا جواب دیتا ہے۔''

''شاید آج میری عقل میرا ساتھ چھوڑ گئی ہے۔ امی کی گمشدگی نے مجھے بدحواس کر دیا ہے۔ ان حالات میں میں کوئی مشورہ، کوئی رائے نہیں دے سکتی ابا جان۔''

''فرزانہ، مجھے تم سے اتنی کم ہمتی کی امید نہیں تھی۔''

''اب میں آپ کو کس طرح بتاؤں ابا جان کہ مجھے امی جان سے کس قدر محبت ہے۔''

''میں جانتا ہوں، تم تینوں کے جذبات سے اچھی طرح واقف ہوں، لیکن یاد رکھو ہمت اور عقل کا دامن چھوڑ کر ہم کچھ بھی نہیں کر سکیں گے۔ میں نے تم سے جو سوال کیا تھا، اس کا جواب میں خود ہی دیتا ہوں۔ میرے خیال میں وہ ٹرک جرائم پیشہ قسم کے لوگوں کا تھا اور تمہاری امی کو یہ معلوم ہو گیا ہو گا کہ ٹرک میں کیا چیز ہے؛ لہٰذا ان حالات میں جرائم پیشہ کسی صورت بھی یہ پسند نہیں کر سکتے کہ وہ واپس جائیں اور پولیس کو ان کے بارے میں بتائیں۔''

''گویا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ امی جان ان لوگوں کی قید میں ہیں۔'' محمود نے اور بھی پریشان ہو کر کہا۔

''ہاں، اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ پولیس کو اور ہمیں ان کے بارے میں ابھی تک کوئی بھی اطلاع نہ ملنے کا اور کیا مطلب ہو سکتا ہے۔''

''اف خدا، اگر یہی بات ہے تو ہم کس طرح انہیں تلاش کریں گے۔'' فرزانہ نے پریشان ہو کر کہا۔

انسپکٹر جمشید کے چہرے پر ایک اداس مسکراہٹ رینگ گئی۔ انہوں نے

تینوں پر ایک نظر ڈالی اور پرسکون آواز میں بولے:

''تمہاری حالت آج بالکل ان ڈاکٹروں جیسی ہے جو خود بیمار ہونے پر پریشان ہو جاتے ہیں۔ اور یہ خیال کرتے ہیں کہ ان کا مرض لاعلاج ہے۔ کوئی ان کا علاج نہیں کر سکے گا، لیکن میں تمہاری طرح خود کو بے بس ہرگز نہیں محسوس کر رہا۔ سنو، اس ٹرک پر روئی کی گانٹھیں لدی ہوئی تھیں۔ ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ روئی کی گانٹھیں اس شہر میں کس جگہ کام میں لائی جاتی ہیں، کیوں نہ ہم کسی روئی کے ڈیلر کے پاس چلیں۔''

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئے۔ محمود نے فوراً جواب دیا۔

''ان حالات میں یہ بہترین ترکیب ہے۔''

''تو پھر آؤ۔''

پندرہ منٹ بعد وہ روئی کے ایک بہت بڑے تاجر کے سامنے موجود تھے۔ تاجر نے ان کا کارڈ دیکھ کر شگفتہ انداز میں پوچھا۔

''فرمایئے، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''

''ہم ایک سنگین مسئلے سے دوچار ہیں۔ امید ہے آپ کچھ مدد فرمائیں گے۔'' یہ کہہ کر انہوں نے مختصر الفاظ میں اپنے ساتھ پیش آنے والے حادثے کا ذکر کیا، پھر بولے:

''شہر بھر میں روئی کی گانٹھوں کی کھپت کہاں کہاں ہے، بس یہ بتا دیں۔''

''ضرور کیوں نہیں۔ یہ تو بہت ہی عام سی بات ہے۔ لکھیے، میں ایسی فرموں کے نام لکھوا دیتا ہوں، جو روئی کی گانٹھیں خریدتے ہیں۔'' یہ کہہ کر انہوں نے نام لکھوانے شروع کیے۔ محمود یہ نام لکھتا چلا گیا۔ انہوں نے دیکھا، ان میں سے اکثر نام کپڑا بنانے والی ملوں کے تھے یا پھر ایسے آڑھتیوں کے نام، جو بازار میں روئی سپلائی کرتے تھے۔ اس روئی سے لحاف وغیرہ تیار کیے جاتے تھے۔

''سوال یہ ہے کہ پہاڑی سڑک کے اس پار سے روئی کا ٹرک شہر میں آ رہا تھا۔ کیا اس طرف روئی کا کوئی گودام ہے۔''

''جی ہاں، روئی کے تمام ڈیلروں کے گودام اس طرف ہی ہیں۔''

''ویری گڈ۔ پھر تو بن گیا کام۔ ہم ان گوداموں سے کیوں نہ اس ٹرک کا پتا کریں۔ آج ہی کی تو بات ہے۔ ظاہر ہے، جن لوگوں نے اس ٹرک پر مال لدوایا ہو گا، وہ اس کے مالک کا نام ضرور بتا سکیں گے۔'' انسپکٹر جمشید نے خوش ہو کر کہا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ محمود، فاروق اور فرزانہ نے بھی مردہ تنوں میں جان پڑتی محسوس کی۔

ایک بار پھر ان کی ٹیکسی پہاڑی سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ وہ اس مقام سے بھی گزرے، جس جگہ سے بیگم جمشید گری تھیں۔ اب وہ اس سمت میں جا رہے تھے، جس طرف سے ٹرک آ رہا تھا۔ یا ٹرک کے آنے کے بارے میں بتایا گیا تھا۔ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ دوسرے ٹرک ڈرائیور محمد شفیع کا بیان ہی بے بنیاد ہو اور اس طرف سے اس کے ٹرک سے پہلے کوئی ٹرک ہی نہ گزرا ہو، لیکن اس خیال کے درست ہونے کی وجہ یہ ہو سکتی تھی کہ اگر بیگم جمشید واقعی اس ٹرک پر نہیں گر گئی تھیں تو پھر وہ سڑک یا کھائی میں کیوں نہیں ملیں۔ ان کے گرنے تک کے کوئی آثار کیوں نہیں ملے۔ لہٰذا وہ اس کے سوا کیا کر سکتے تھے کہ روئی کے گوداموں تک پہنچ جائیں اور آخر کار وہ پہنچ گئے۔

ایک گودام کے سامنے انہیں ایک ٹرک کھڑا نظر آیا۔ اس پر روئی کی گانٹھیں لادی جا رہی تھیں۔ لیکن ٹرک کا رنگ سرخ اور نیلا نہیں تھا۔

☆☆☆

ہوٹل ذی شان

ٹیکسی سے اتر کر وہ آگے بڑھے اور روئی لادنے والے مزدوروں سے بولے:

"میں یہاں کے منتظم سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"اندر چلے جائیے۔" ایک مزدور نے کہا۔

چاروں اندر کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ ایک کمرے میں ایک بڑی سی میز کے دوسری طرف ایک بہت موٹا آدمی بیٹھا نظر آیا۔ اس کی آنکھوں پر ایک چشمہ تھا۔ ان کے قدموں کی آہٹ سن کر اس نے اوپر نظر اٹھائی اور پھر بولا:

"فرمائیے، میں کیا خدمت کر سکتا ہوں۔"

انہوں نے اپنا کارڈ اسے دکھایا اور بولے:

"ہم ایک سرخ اور نیلے رنگ کے ٹرک کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔ اس ٹرک پر آج ہی روئی لدوائی گئی ہے۔"

"ٹھہریے، میں ابھی رجسٹر دیکھ کر بتاتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے ایک رجسٹر کھولا۔ چند سیکنڈ کے لیے اسکے اندراجات پر نظر ڈالی، پھر بولا:

"ہمارے ہاں سے آج صرف تین ٹرک لوڈ کیے گئے ہیں۔ میرے پاس صرف ٹرکوں کے نمبر درج ہوتے ہیں۔ ان کے رنگ نہیں لکھے جاتے۔ اس لیے

مزدوروں سے پوچھنا پڑے گا۔" یہ کہہ کر اس نے میز پر رکھی گھنٹی پر زور زور سے ہاتھ مارا، پھر خود بھی دھاڑا۔

"اوئے کالو، جلدی ادھر آ۔"

فوراً ہی ایک مزدور اندر آیا۔ یہ وہی مزدور تھا جس نے انہیں اندر جانے کے لیے کہا تھا۔

"کیا حکم ہے جناب۔"

"ارے آج جو سرور اینڈ کو کا مال لادا ہے، اس ٹرک کا رنگ کیسا تھا؟"

"جی پیلا اور کالا۔"

"اور شیخ برادرز کے ٹرک کا رنگ کیسا تھا؟"

"سرخ اور نیلا۔"

"کیا کہا؟ کیسا رنگ تھا؟"

"سرخ اور نیلا ہی کہا ہے جناب میں نے۔" مزدور نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

"اور یہ منہ کیوں بن رہا ہے۔"

"دیکھیے جناب، مزدور کی بھی کوئی عزت ہوتی ہے۔ آپ ابے تبے کر کے نہ بلایا کیجئے۔"

"چل بے بھاگ۔ اور غلام خان کو بھیج دے۔"

مزدور اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتا چلا گیا۔ جلد ہی دوسرا مزدور اندر داخل ہوا۔ اس نے اس سے بھی یہی سوال کیے۔ اس نے بھی یہی بتایا کہ شیخ برادرز کے ٹرک کا رنگ سرخ اور نیلا تھا۔

"کیا تیسرے مزدور سے بھی تصدیق کر لی جائے، تاکہ کسی قسم کا شک نہ

رہے۔" موٹے نے کہا۔

"ہاں، بہتر تو یہی ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔ اب ان کے چہروں پر تازگی دوڑنے لگی تھی۔ اتنی دیر کی بھاگ دوڑ کے بعد یہ پہلا سراغ انہیں ملا تھا۔

تیسرے مزدور نے بھی اس بات کی تصدیق کر دی۔ اب تو انہیں یقین ہو گیا کہ مزدوروں کا بیان درست ہے۔ وہ موٹے کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ باہر نکلتے ہی انسپکٹر جمشید نے ایک دوسرے گودام کا رخ کیا۔ یہ دیکھ کر فرزانہ سے نہ رہا گیا، اس نے کہا۔

"اب ادھر جانے کی کیا ضرورت ہے ابا جان۔"

"دیکھنا یہ ہے کہ سرخ اور نیلا ٹرک روئی کی گانٹھیں لینے صرف اسی گودام تک آتا ہے یا کسی اور گودام سے بھی لے جاتا ہے، کہیں ایسا تو نہیں کہ سرخ اور نیلا رنگ صرف ایک ٹرک کا نہ ہو، اس رنگ کے کچھ اور ٹرک بھی ہوں۔ اس صورت میں ہمیں ان ٹرکوں کے بھی نمبر معلوم کرنا پڑیں گے۔ اس ٹرک کا نمبر اور شیخ برادرز کا پتا تو ہم معلوم کر ہی چکے ہیں۔ تھوڑی دیر اور صرف کرنے میں کوئی نقصان نہیں ہو جائے گا۔ اس وقت تک جو کچھ ہونا ہے ہو چکا ہے۔" ان کا لہجہ پر سکون تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ دوسرے گودام سے معلومات حاصل کر رہے تھے دوسرے گودام سے کسی نیلے اور سرخ رنگ کے ٹرک کا سراغ نہیں ملا۔ آخر آس پاس جتنے بھی گودام تھے، انہوں نے سب سے معلوم کر لیا اور آخر انہیں یقین ہو گیا کہ پورے شہر میں سرخ اور نیلے رنگ کا صرف ایک ہی ٹرک ہے۔ اور وہ ہے شیخ برادرز کا۔

اب ان کی ٹیکسی شیخ برادرز کے پتے کی طرف روانہ ہو گئی۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا، ورنہ وہ اڑ کر وہاں پہنچ جاتے۔ شیخ برادرز کا پتا تلاش کرنے میں انہیں کوئی خاص وقت نہیں ہوئی۔ یہ انگریزی دواؤں کی ایک فرم تھی۔ انہوں نے کاؤنٹر پر موجود

سیلز مینوں میں سے ایک سے پوچھا:

"میں فرم کے مالک یا منیجر سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"کیا آپ نے ان سے ملاقات کا وقت لے رکھا ہے؟"

"نہیں، ملاقات کا وقت لینے کا وقت ہی نہیں ملا، آپ یہ کارڈ ان تک پہنچا دیں۔" انہوں نے اداس مسکراہٹ لبوں پر لاتے ہوئے کہا۔

سیلز مین نے کارڈ پر نظر ڈالے بغیر ان کی طرف دیکھا اور بولا:

"معاف کیجئے گا جناب، انہوں نے اس کی اجازت نہیں دے رکھی۔"

"لیکن یہ کارڈ تمہیں ان تک پہنچانا ہی ہو گا۔" انسپکٹر جمشید کے لہجے میں سختی آ گئی۔ ان کی آنکھیں غصے سے لبریز ہو گئیں۔ چہرے کے نقوش تن گئے۔ سیلز مین نے بوکھلا کر ان کی طرف دیکھا اور پھر نہ جانے کیوں کانپ کر رہ گیا۔ ان کی آنکھوں میں اسے ایک خونخوار چمک نظر آئی تھی۔ اس نے تھر تھر کانپتے ہاتھوں سے کارڈ اٹھایا اور دائیں طرف جانے والے زینے کی سیڑھیاں چڑھتا چلا گیا۔

محمود، فاروق اور فرزانہ نے بھی گھبرا کر انسپکٹر جمشید کی طرف دیکھا، لیکن ان کے چہرے پر وہی نرمی تھی، مٹھاس تھی اور حالیہ واقعے کا دکھ کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔ جلد ہی سیلز مین آتا نظر آیا۔ اس نے کاؤنٹر پر پہنچتے ہی کہا:

"اوپر تشریف لے جائیے جناب، فرم کے مالک سب سے آخری کمرے میں تشریف رکھتے ہیں۔ دروازے پر ڈاکٹر شریف شیخ لکھا ہوا ہے۔"

"شکریہ۔" انہوں نے کہا اور تینوں کو پیچھے آنے کا اشارہ کرتے ہوئے زینے کی طرف بڑھے۔ سیڑھیاں طے کرنے کے بعد انہوں نے دیکھا، وہ ایک برآمدے میں تھے۔ برآمدہ کافی طویل تھا اور زینے کے دونوں طرف تھا، انہوں نے دائیں طرف کا رخ کیا اور برآمدے کے آخری سرے تک چلے گئے۔ آخری کمرے

کے دروازے پر ڈاکٹر شریف شیخ کے نام کی تختی نظر آئی۔ دروازے پر ایک باوردی چپراسی بیٹھا نظر آیا۔

''ہمیں شیخ صاحب سے ملنا ہے۔''

''ابھی ابھی سیلز مین آپ کا ہی کارڈ لے کر آیا تھا۔'' اس نے پوچھا۔

''جی ہاں۔'' وہ بولے۔

''اندر تشریف لے جائیے۔ صاحب آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔'' اس نے شائستہ لہجے میں کہا۔

چاروں اندر داخل ہوئے۔ انہوں نے دیکھا، کمرہ بہترین طرز پر سجایا گیا تھا۔ ہر چیز سے امارت ٹپک رہی تھی۔ آبنوس کی بنی ہوئی ایک میز کے دوسری طرف ایک سرخ و سفید رنگ کا آدمی آنکھوں پر چاندی کے فریم کا چشمہ لگائے بیٹھا تھا۔ دروازہ کھلنے کی آواز سن کر اس نے نظریں اوپر اٹھائیں اور بولا:

''آپ کی آمد میرے لیے بہت حیران کن اور پریشان کن ہے۔''

''ہم ایک معاملے کی تفتیش کر رہے ہیں۔ ٹرک نمبر ایف کے تین سو دس آپ کی فرم کی ملکیت ہے؟''

''ٹرک نمبر تین سو دس ایف کے۔'' اس نے بڑبڑانے کے انداز میں کہا۔ ساتھ ہی اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے، جیسے کچھ سوچنے لگا ہو۔

''جی ہاں، اس کا رنگ سرخ اور نیلا ہے۔'' وہ بولے۔

''میرا خیال ہے اس نمبر کا ٹرک ہمارے پاس تھا ضرور۔ لیکن اس وقت اس کا رنگ سفید تھا۔ ہماری تمام گاڑیوں کا رنگ سفید ہے۔'' اس نے کہا۔

''آپ اس فرم کے مالک ہیں؟'' وہ بولے۔

''جی ہاں، میرے ساتھ میرے تین بھائی اور اس کاروبار میں شریک

ہیں۔ وہ ملک کے تمام حصوں میں دوائیں سپلائی کرتے ہیں۔''

''آپ نے یہ کیا کہا کہ اس نمبر کا ٹرک آپ کے پاس تھا ضرور۔'' فرزانہ نے حیران ہو کر کہا۔

''ہاں، لیکن اب وہ ہمارے پاس نہیں ہے۔ وہ پرانا ہو گیا تھا اور ہم نے اسے فروخت کر دیا۔'' اس نے نئی سنائی۔

''کس کے ہاتھ؟'' انسپکٹر جمشید چونکے۔ محمود، فاروق اور فرزانہ کو اپنے دل ڈوبتے محسوس ہوئے۔

''میں اپنے اکاؤنٹینٹ کو بلاتا ہوں، اس بارے میں آپ کو وہی معلومات بہم پہنچا سکے گا۔''

''بہت بہت شکریہ، لیکن ذرا جلدی کیجئے۔ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔'' انہوں نے قدرے پریشان ہو کر کہا۔

ڈاکٹر شریف شیخ نے گھنٹی بجائی۔ چپراسی فوراً ہی اندر داخل ہوا۔

''حامد غوری کو بلا لاؤ۔''

''بہت بہتر سر۔'' چپراسی نے فوراً کہا اور کمرے سے نکل گیا جلد ہی ایک گول مٹول سا آدمی اندر داخل ہوا۔

''یس سر۔''

''مسٹر غوری، ہم نے ٹرک نمبر ایف کے تین سو دس کس کے ہاتھ بیچا تھا اور کب، اس کے بارے میں سب کچھ انہیں بتا دیں۔''

''جی بہتر، آئیے جناب۔'' حامد غوری نے کہا۔

وہ اس کے پیچھے کمرے سے نکل آئے اور دو تین کمرے چھوڑ کر ایک کمرے میں داخل ہوئے۔ حامد غوری نے انہیں کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور پھر خود

ایک رجسٹر کھول کر بیٹھ گیا۔ جلد ہی اس نے سر اوپر اٹھایا۔ اور بولا:

''ٹرک نمبر ایف کے تین سو دس ایک شخص عباس شاہین کے ہاتھ آج سے تقریباً چھ ماہ پہلے فروخت کیا جا چکا ہے۔''

''اس کا پتا۔'' انسپکٹر جمشید بولے۔

''تیرہ گرین سکوائر۔'' اس نے کہا۔ محمود نے یہ نام اور پتا نوٹ کر لیا۔ اسی وقت انسپکٹر جمشید نے سوال پوچھا:

''اور یہ شخص کام کیا کرتا ہے؟''

''خدا جانے ہمیں تو ٹرک فروخت کرنا تھا۔ سو ہم نے اس کے ہاتھوں فروخت کر دیا۔'' حامد غوری نے کہا۔

''بہت بہت شکریہ! ہم خود ہی اس سے پوچھ لیں گے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ باہر نکلتے ہوئے فاروق نے سرد آہ بھری اور بولا:

''یہ ٹرک کا معاملہ تو لمبا ہی ہوتا جا رہا ہے۔''

''جب ہمیں کسی چیز کی بے چینی ہوتی ہے تو اس تک پہنچنے کے سلسلے میں روڑے اٹکا ہی کرتے ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انسان حوصلہ ہار بیٹھے۔ آؤ عباس شاہین کے پاس چلتے ہیں۔''

آدھ گھنٹے کے بعد وہ ۱۳ گرین سکوائر کے سامنے کھڑے گھنٹی بجا رہے تھے۔ یہ ایک عظیم الشان کوٹھی تھی۔ ایک بار پھر ان کے دل زور زور سے دھڑک رہے تھے۔ کامیابی کے عین نزدیک پہنچ کر دل اسی طرح دھڑکا کرتے ہیں، جب کہ معلوم نہ ہو کہ کامیابی حاصل ہو گی یا نہیں۔ گھنٹی کے جواب میں ایک سیاہ رنگ کا لڑکا نمودار ہوا۔ وہ افریقی تھا۔ اس نے ایک اچٹتی نظر ان پر ڈالی اور بولا:

''آپ کو کس سے ملنا ہے؟''

''عباس شاہین سے۔'' وہ بولے۔

''عباس شاہین۔ یہ کون صاحب ہیں؟''

''۱۳ گرین سکوائر یہی ہے نا؟''

''جی ہاں، بالکل یہی ہے۔'' لڑکے نے کہا۔

''تو پھر یہاں کون رہتا ہے؟''

''یہاں شیروانی صاحب رہتے ہیں۔''

''شیروانی صاحب۔'' ان کے منہ سے حیرت زدہ لہجے میں کہا۔

''ہاں ٹھیک ہے، ہم شیروانی صاحب سے ہی ملاقات کریں گے۔ شاید ہمیں کسی نے ان کا نام غلط بتا دیا ہے۔ مہربانی فرما کر میرا کارڈ ان تک پہنچا دو۔''

''جی اچھا۔'' لڑکے نے کہا اور کارڈ لے کر چلا گیا۔

''شیروانی تو ایک لباس کا نام ہے نا ابا جان۔'' فرزانہ کے لہجے میں قدرے حیرت تھی۔

''ہاں، لیکن یہ شاید ذات بھی ہے۔'' اسی وقت لڑکا دوبارہ نمودار ہوا اور بولا:

''چلیے جناب، شیروانی صاحب ڈرائنگ روم میں آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔''

وہ لڑکے کے پیچھے چلتے ہوئے ڈرائنگ روم میں پہنچے۔ انہوں نے دیکھا، یہاں ایک ادھیڑ عمر کا سفید ڈاڑھی والا آدمی بیٹھا تھا۔ اس نے پینٹ کوٹ پہن رکھا تھا۔ جب کہ فرزانہ یہ خیال کر رہی تھی کہ ڈرائنگ روم میں انہیں جو شخص نظر آئے گا، وہ شیروانی پہنے ہوئے ہو گا۔

''آئیے جناب، تشریف لائیے میں کیا خدمت کر سکتا ہوں۔''

''شیخ برادرز میڈیسن کمپنی کے اکاؤنٹنٹ نے ہمیں بتایا ہے کہ ایک شخص عباس شاہین نے ان سے ایک ٹرک خریدا تھا اور اس نے اپنا پتا ۱۳ گرین سکوائر لکھوایا تھا۔ ہمیں اس شخص سے کچھ سوالات کرنا تھے، لہٰذا یہاں چلے آئے، لیکن آپ کے ملازم نے بتایا کہ یہاں تو عباس شاہین نام کا کوئی آدمی نہیں رہتا۔ مجھے یہ سن کر بہت حیرت ہوئی اور میں نے مناسب سمجھا کہ اس بارے میں آپ سے ہی معلوم کرلوں۔ شاید لڑکے کو معلوم نہ ہو۔''

''مجھے تو یہاں رہتے ہوئے ایک عرصہ بیت گیا۔ میں نے آج تک عباس شاہین کے نام کے کسی آدمی کا ذکر نہیں سنا۔ پہلی بار آپ کے منہ سے یہ نام سن رہا ہوں۔''

''اس کا مطلب ہے، اس آدمی نے اپنا پتا غلط لکھوایا تھا۔'' انسپکٹر جمشید کی آواز بجھ سی گئی۔ ایک امید جو پیدا ہوئی تھی، ختم ہوگئی۔

شیروانی صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے وہ باہر نکل آئے۔

ایک جنرل اسٹور سے انہوں نے اکرام کو فون کیا اور تازہ ترین خبریں معلوم کیں، لیکن ابھی تک کوئی سراغ نہیں مل سکتا تھا۔ انہوں نے اکرام کو چند ہدایات دیں اور ایک بار پھر شیخ برادرز کی فرم کی طرف روانہ ہوگئے۔

''ابا جان، میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔'' فرزانہ نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔

''میں تمہیں اس قدر کم ہمت نہیں سمجھتا تھا فرزانہ۔'' انسپکٹر جمشید بولے۔

''ہمیں ایسا معلوم ہو رہا ہے، جیسے ہم غلط سمت میں جا رہے ہیں۔ میرا مطلب ہے، ہماری تفتیش غلط سمت میں جا رہی ہے۔'' محمود بولا۔

''جبکہ میں ایسا نہیں سمجھتا سنو، میرا شروع سے یہ خیال ہے کہ وہ ٹرک کسی جرائم پیشہ گروہ یا آدمی کا ہے۔ اب غور کرو، ایک شخص نے وہ ٹرک خریدا تھا۔ اس پر اپنا

نام عباس شاہین لکھوایا تھا اور پتا ۱۳ گرین سکوائر۔ لیکن اس پتے پر ہمیں اس نام کا آدمی نہیں مل سکا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ شخص ضرور کوئی جرائم پیشہ تھا، اسی لیے اس نے اپنا غلط بتایا تھا، اگر یہ بات نہ ہوتی تو وہ پتا غلط نہ بتاتا۔ ہوسکتا ہے، اس نے اپنا نام بھی غلط بتایا ہو۔ ان حالات میں تو ہماری تفتیش بالکل درست رخ میں جا رہی ہے۔'' انسپکٹر جمشید کہتے چلے گئے۔

''ہوں، آپ کا خیال ٹھیک ہے، لیکن آپ دوبارہ شیخ برادرز کے ہاں کیوں جا رہے ہیں؟''

''اس لیے کہ ہم نے عباس شاہین کا حلیہ معلوم نہیں کیا۔'' انہوں نے کہا۔

''لیکن حلیہ تو آپ فون پر بھی معلوم کرسکتے تھے۔''

''نہیں، سامنے بیٹھے ہوئے شخص سے جس قدر صحیح بات معلوم کی جاسکتی ہے، فون پر نہیں کی جاسکتی۔'' وہ بولے۔

آخر ایک بار پھر وہ شیخ برادرز کے اکاؤنٹنٹ حامد غوری کے کمرے میں داخل ہو رہے تھے۔ حامد غوری نے انہیں حیران ہوکر دیکھا۔

''خیر تو ہے جناب، آپ لوگ پھر آگئے۔''

''جی ہاں، ٹرک نمبر ایف کے تین سو دس ایک غلط آدمی نے خریدا تھا۔'' انسپکٹر جمشید بولے۔

''جی کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ ۱۳ گرین سکوائر پر کوئی عباس شاہین نہیں رہتا، نہ رہتا تھا۔''

''اوہ، لیکن جناب، اس میں ہمارا کیا قصور؟ ہم تو اپنا ایک پرانا ٹرک فروخت کرنا چاہتے تھے، سو ہم نے فروخت کردیا۔ ہم سے ٹرک کون لینے آیا تھا، وہ کس قسم کا آدمی تھا، بھلا یہ جاننے کی ہمیں کیا ضرورت تھی؟''

"تو میں کب کہتا ہوں کہ اس میں آپ کا قصور ہے۔"

"پھر آپ دوبارہ کس لیے تشریف لائے ہیں؟"

"عباس شاہین آپ سے آ کر ملا تھا؟" انہوں نے اس کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں، ادارے کی پرانی چیزیں میں ہی فروخت کرتا ہوں۔ میری اس سے ملاقات ہوٹل ذی شان میں ہوئی تھی۔"

"اس کا حلیہ کیا تھا۔ اچھی طرح یاد کر کے بتائیے گا اور پوری تفصیل سے۔" وہ بولے۔ ان کے ساتھ محمود، فاروق اور فرزانہ کی نظریں بھی حامد غوری پر جم گئیں۔

"وہ ایک لمبے سے قد کا آدمی تھا۔ سرخ و سفید تھا۔ چہرے پر مونچھیں بھی نہیں تھیں۔ ناک لمبی اور پتلی، ہونٹ بھی پتلے اور سرخ رنگ کے۔ آنکھیں بھوری۔ پیشانی تنگ اور بال سنہری مائل سیاہ تھے۔ اس کے ہاتھوں کی انگلیاں بہت لمبی تھیں۔ یہ بات مجھے اس طرح یاد رہ گئی کہ جب اس نے رجسٹر پر دستخط کیے تھے تو مجھے اس کی لمبی انگلیاں دیکھ کر حیرت ہوئی تھی۔" حامد غوری حلیہ بتاتا چلا گیا۔

"ویری گڈ، حلیہ تو آپ نے بہت تفصیل سے بتایا۔ اس کے دستخط مجھے دکھا دیجیے اور یہ بھی بتا دیں کہ اس نے ٹرک کس تاریخ کو خریدا تھا۔"

"ٹرک اس نے گیارہ جولائی کو خریدا تھا؛ گویا تقریباً چھ ماہ پہلے۔ یہ کہہ کر اس نے دستخط ان کے سامنے کر دیے۔ انہوں نے چند لمحے تک دستخطوں کو بغور دیکھا اور پھر قلم جیب سے نکال کر محمود کی نوٹ بک پر دستخط کی نقل شروع کر دی۔ دو منٹ بعد وہ بالکل ملتے جلتے دستخط کرنے کے قابل ہو گئے۔ انہوں نے قلم جیب میں لگا لیا اور اٹھتے ہوئے بولے:

"شاید مجھے پھر بھی آپ سے سوالات کرنے کے لیے آنا پڑے۔ آپ کی

کمپنی چھٹی تو نہیں کرتی کسی دن؟"

"جی ہاں، جمعے کے روز بند رہتی ہے۔"

"بہت بہت شکریہ۔ کیا میں آپ کا فون استعمال کر سکتا ہوں۔"

"جی ہاں، شوق سے۔"

انہوں نے اکرام کے نمبر ڈائل کیے اور بولے:

"ہیلو اکرام، ایک آدمی کا حلیہ نوٹ کر لو۔ اس کا نام عباس شاہین بتایا جاتا ہے۔ اسے پورے شہر میں تلاش کرانا ہے۔ یہ جہاں بھی نظر آئے۔ مجھے فوراً وائرلیس پر اطلاع دی جائے۔ ہم خود بھی اس کی تلاش میں نکل رہے ہیں۔ یہ کہہ کر انہوں نے حلیہ تفصیل سے بتا دیا۔ پھر ریسیور رکھتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور بولے:

"بہت بہت شکریہ غوری صاحب۔ آپ کی فرم کی دوائیں کیسی جا رہی ہیں۔"

"بس ٹھیک ٹھاک جا رہی ہیں۔ دراصل مقابلے میں بہت بڑی بڑی غیر ملکی کمپنیاں ہیں۔ ان کے پاس وسائل بہت ہیں۔"

"ہوں، اچھا جناب، بڑی مہربانی۔" یہ کہہ کر وہ باہر نکل آئے۔

جیپ کے پاس پہنچ کر وہ رک گئے اور پریشان نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے، کیونکہ اب ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں۔ بیگم جمشید کے بغیر گھر جانے کا خیال بھی تکلیف دہ تھا۔ آخر انہوں نے وہی کیا جو اکرام سے کہا تھا، یعنی عباس شاہین کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ لمحہ بہ لمحہ انہیں یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے بیگم جمشید ان سے دور ہوتی جا رہی ہوں۔ پہلی مرتبہ انسپکٹر جمشید نے بھی اپنا دل بیٹھتا محسوس کیا۔ ابھی تک اس ٹرک کا بھی تو کوئی سراغ نہیں لگ سکا تھا۔ وہ کسی کو نظر نہیں آیا تھا۔ گودام والے تینوں مزدوروں کی تصدیق کے بعد انہیں اس بات میں

کوئی شبہ نہیں رہا تھا کہ بیگم جمشید ضرور سرخ اور نیلے رنگ کے ٹرک میں گرگئی تھیں اور یہ بھی کہ اس پر روئی کی گانٹھیں لدی ہوئی تھیں۔ انہیں حیرت اس بات پر بھی تھی کہ اس جرائم پیشہ آدمی یعنی عباس شاہین کو آخر رو کے رکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ کچھ بھی ہو، ابھی تک وہ شدید قسم کی ناکامی سے دوچار تھے اور کوئی کام کا سراغ نہیں لگ سکا تھا۔ سارے دن کے تھکے ہارے وہ تیسرے پہر ایک ہوٹل میں چند لمحے بیٹھنے پر مجبور ہو گئے۔ اچانک انسپکٹر جمشید کو ہوٹل ذی شان کا خیال آیا۔ انہوں نے جیپ کا رخ اس طرف کر دیا۔

''میرا خیال ہے، ہمیں کچھ کھا لینا چاہیے۔ بھوکے پیاسے ہم اپنی تلاش کو جاری نہیں رکھ سکیں گے۔'' انسپکٹر جمشید نے ان کی طرف دکھ بھرے انداز میں دیکھتے ہوئے کہا۔ اب وہ ہوٹل ذی شان کے ہال میں بیٹھے تھے اور ہال میں موجود لوگوں کو غور سے دیکھ رہے تھے۔

''لیکن ابا جان، ہم امی کے بغیر کیسے کچھ کھا سکتے ہیں۔ کیا خبر انہیں کچھ کھانے کو نصیب ہوا ہے یا نہیں۔ ہمیں تو یہ بھی پتا نہیں کہ وہ کس حال میں ہیں۔''

''جو خدا پتھر میں کیڑے کو رزق پہنچا سکتا ہے، وہ تمہاری امی کو بھی بھوکا نہیں رکھے گا۔ اس پر بھروسا کر کے کچھ کھا لو۔'' انسپکٹر جمشید بولے۔

''بہت بہتر۔'' تینوں ایک ساتھ بولے اور انہوں نے بیرے کو اشارہ کیا۔ وہ تیزی سے ان کی طرف آیا۔ انسپکٹر جمشید نے مینو پر نظر ڈالنے کے بعد اسے کچھ چیزوں کا آرڈر دیا۔ بیرا ان کا آرڈر لے کر ابھی گیا بھی نہیں تھا کہ فرزانہ کی نظریں ایک کیبن میں پڑیں۔ بیرا کیبن کا پردہ ہٹا کر باہر نکلا تھا۔ اسی لیے فرزانہ اندر دیکھنے میں کامیاب ہوگئی اور پھر اس کے چہرے پر حیرت اور جوش کے آثار نمودار ہو گئے۔

☆☆☆

نیلی کار والا

محمود، فاروق اور انسپکٹر جمشید نے فرزانہ کی آنکھوں میں حیرت کے دیے جلتے دیکھے تو وہ بھی اس کی نظروں کا تعاقب کرتے ہوئے کیبن کی طرف دیکھنے پر مجبور ہو گئے۔ لیکن اس وقت تک پردہ گر چکا تھا۔

''تمہیں کیبن میں کیا نظر آیا ہے۔''

''عباس شاہین۔'' فرزانہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔

''کیا مطلب؟ تم کس طرح کہہ سکتی ہو کہ کیبن میں عباس شاہین موجود ہے۔''

''میرا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس حلیے کا آدمی اندر موجود ہے، جو حامد غوری نے ہمیں بتایا ہے۔''

''ویری گڈ فرزانہ، ہم اس کا بہت احتیاط سے تعاقب کریں گے۔ لیکن پہلے میں ایک نظر اندر ڈال لوں۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ فرزانہ کو غلط فہمی ہوئی ہو۔'' انہوں نے کہا۔

''میرا خیال ہے، بیرا اس کا آرڈر لے کر گیا ہے، یا پھر بل لینے گیا ہے۔ وہ واپس آئے گا تو پردہ اٹھا کر اندر داخل ہوگا۔ اس وقت آپ اسے دیکھ سکتے ہیں۔''

''ہوں ٹھیک ہے۔'' وہ بڑبڑائے۔

چاروں کی نظریں جیسے پردے سے چپک سی گئیں۔ آخر خدا خدا کر کے بیرا اس کیبن کی طرف آتا نظر آیا۔ اس کے ساتھ ہی ان کی میز والا بیرا بھی کھانے کی ٹرے اٹھائے میز پر پہنچ گیا۔ لیکن انہوں نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا اور پھر دوسرا بیرا کیبن کا پردہ اٹھا کر اندر داخل ہوا، انہیں اسی لمحے کا انتظار تھا۔ تینوں نے ایک نظر میں ہی اندر بیٹھے آدمی کو دیکھ کر اندازہ لگا لیا کہ فرزانہ کا اندازہ غلط نہیں ہے۔ اندر واقعی حامد غوری کے بتائے ہوئے حلیے کا آدمی موجود تھا۔

''میں باہر جا رہا ہوں۔ اگر اس نے کسی کار یا ٹیکسی کے ذریعے سفر کیا تو تم بھی جیپ میں سوار ہو جانا اور اگر اس نے پیدل کسی سمت کا رخ کیا تو تم تینوں کمال احتیاط سے اس کا تعاقب کرو گے، میں جیپ لیے تم سے کافی فاصلے پر آ رہا ہوں گا تا کہ کسی وقت بھی گاڑی کے ذریعے تعاقب کی ضرورت پیش آئے تو ہم فوراً جیپ کو کام میں لا سکیں۔'' انہوں نے جلدی جلدی کہا۔

''تو کیا ہم یہیں ٹھہریں۔'' محمود نے پوچھا۔

''ہاں، اس آدمی کو ہر حال میں نظروں میں رکھنا ہے۔ یہ نظروں سے اوجھل نہ ہو جائے۔ اس ہوٹل کے اور بھی دروازے ہوں گے۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ یہ کسی اور دروازے سے نکل جائے۔''

''بہت بہتر، آپ چل کر جیپ میں بیٹھیں۔'' فرزانہ بولی۔

وہ اٹھے اور ہال سے باہر نکل گئے۔ اس وقت انہیں یاد آیا کہ انسپکٹر جمشید کچھ کھائے پیے بغیر ہی چلے گئے تھے۔ انہوں نے بھی کھانے کو ہاتھ نہ لگایا۔ بیرے کو اشارے سے بلایا اور محمود نے کہا۔

''ہمیں اچانک ایک جگہ جانا پڑ گیا ہے، یہ کھانا پیک کر دیں، اور ہاں بل بھی لیتے آئیں۔ اگر آپ کو دیر ہو گئی تو ہمیں جانا پڑ جائے گا۔ اس صورت میں ہم میز

پر سو روپے کا نوٹ رکھ جائیں گے۔ بل سو روپے سے زائد کا تو نہیں بنے گا۔''

''جی ہاں، کچھ زیادہ کا بنے گا۔'' بیرے نے چیزیں سمیٹتے ہوئے کہا۔

''اچھی بات ہے، ہم میز پر زائد رکھ رہے ہیں۔ آپ ذرا جلد آنے کی کوشش کریں۔''

بیرا چلا گیا۔ وہ اس کا انتظار کرنے لگے۔ عین اسی وقت کیبن کا پردہ ہٹا اور عباس شاہین کے حلیے کا آدمی کیبن سے باہر نکل کر دروازے کی طرف بڑھا۔

''لو بھئی، وہ جا رہا ہے۔''

''اور ہمارے والا بیرا ابھی تک نہیں پہنچا۔ خیر میں ایک سو پچیس روپے میز پر رکھے دیتا ہوں۔''

وہ پیسے رکھ کر اٹھے ہی تھے کہ بیرا آتا نظر آیا۔ انہوں نے جلدی سے آگے بڑھ کر پیکٹ اس کے ہاتھ سے لے لیا اور پوچھا۔

''بل کتنا بنا؟''

''ایک سو پندرہ روپے پچانوے پیسے۔''

''میز پر ایک سو پچیس روپے رکھے ہیں، بقیہ آپ کی ٹپ۔'' یہ کہتے ہوئے وہ تیزی سے دروازے کی طرف چلے۔ اسی وقت شاہین کے حلیے کا آدمی دروازہ عبور کر گیا۔ انہوں نے رفتار اور بڑھا دی۔ جب وہ باہر نکلے تو عباس شاہین ایک نیلے رنگ کی کار میں بیٹھ رہا تھا اور انسپکٹر جمشید جیپ کو اسٹارٹ کر چکے تھے۔ ان کے دیکھتے ہی دیکھتے کار ایک سمت میں مڑ گئی۔ فوراً ہی جیپ حرکت میں آئی۔ محمود، فاروق اور فرزانہ نے دوڑ لگا دی، پھر جونہی وہ پچھلے حصے میں سوار ہونے میں کامیاب ہوئے، جیپ کی رفتار بڑھ گئی۔ انسپکٹر جمشید نے وائرلیس سیٹ آن کیا اور اکرام سے رابطہ قائم کرتے ہی وہ بولے۔

''ہیلو، میں اس وقت ایک کار کا تعاقب کر رہا ہوں۔ یہ کار نیلے رنگ کی ہے۔ اس کا نمبر جے اے ۳۰۰۷ ہے۔ یہ شہر کی جنوبی سڑک پر سفر کر رہی ہے۔ میں چاہتا ہوں ہماری کچھ کاریں اس سے آگے پہنچ کر چلنا شروع کر دیں تا کہ ہم درمیانی فاصلہ بڑھا سکیں اور تعاقب کا شبہ نہ ہو سکے۔ تعاقب کرنے والی گاڑیوں کو چاہیے کہ مغربی سڑک پر چکر کاٹ کر جنوبی سڑک پر پہنچ جائیں۔ اس وقت سے ٹھیک پندرہ منٹ بعد نیلی کار کے تیرھویں میل پر پہنچنے کا امکان ہے۔'' انہوں نے اسپیڈ بتانے والے میٹر پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

''بہت بہتر سر، میں ابھی اس کا انتظام کرتا ہوں۔''

''شکریہ......'' انہوں نے کہا اور سیٹ بند کر دیا۔

''معلوم ہوتا ہے، یہ شخص ہوٹل ذی شان کا مستقل گاہک ہے۔ حامد غوری سے بھی اس کی ملاقات وہیں ہوئی تھی۔'' انسپکٹر جمشید بولے۔

''جی ہاں، نظر تو یہی آتا ہے۔''

تقریباً پندرہ منٹ بعد وائرلیس پر اشارہ موصول ہوا۔ دوسری طرف اکرام تھا۔

''ہماری تین گاڑیاں نیلی کار کے آگے ہیں آپ بے فکر ہو کر درمیانی فاصلہ بڑھا سکتے ہیں۔''

''کیا نمبروں کے بارے میں اطمینان کیا جا چکا ہے؟'' انہوں نے پوچھا۔

''جی ہاں، آپ نے کار کا نمبر جے اے تین ہزار سات بتایا تھا اور ہماری گاڑیاں اس وقت اس کار کے آگے سفر کر رہی ہیں۔''

''بہت خوب۔'' انہوں نے کہا، سیٹ بند کر دیا اور درمیانی فاصلہ بڑھانے لگے۔ جلد ہی اگلی گاڑیوں کی طرف سے اشارہ موصول ہوا۔

''ہیلو سر، جے اے تین ہزار سات ایک بہت بڑی عمارت کے سامنے رک گئی ہے۔''

''اچھا، ہم آ رہے ہیں۔ عمارت سے کچھ فاصلے پر رک جائیں اور یہ خیال رکھیں کہ کار سے اُتر کر کار والا کہاں جاتا ہے۔''

''جی بہتر۔'' دوسرے طرف سے کہا۔

انسپکٹر جمشید نے رفتار بڑھا دی۔ جلد ہی وہ ان گاڑیوں تک پہنچ گئے۔ جوں ہی انہوں نے جیپ روکی، ایک آدمی تیر کی طرح ان کی طرف آیا اور بولا۔

''نیلی کار والا سامنے والی عمارت میں گیا ہے۔ اس کی کار وہ سامنے کھڑی ہے۔''

انہوں نے دیکھا، عمارت کی پیشانی پر ایک سرخ رنگ کا بہت بڑا بورڈ لگا ہوا تھا۔ اس پر سفید لفظوں میں جاوا اینڈ کو لکھا تھا۔ نیچے نسبتاً چھوٹے لفظوں میں لکھا تھا۔ تمام کمپنیوں کی ادویات کے آرڈر سپلائرز۔

''گویا یہ تمام کمپنیوں کی ادویات کے آرڈرز دکانداروں سے حاصل کر کے انہیں مال پہنچانے کا کام کرتے ہیں۔ آرڈرز کے مطابق یہ تمام کمپنیوں سے مال خرید لیتے ہوں گے۔'' انسپکٹر جمشید بڑبڑائے۔ پھر تعاقب میں آنے والی گاڑیوں کے ڈرائیوروں سے بولے:

''ہم اندر جا رہے ہیں۔ آپ لوگ چوکنے رہیں۔ اگر نیلی کار والا کار میں بیٹھ کر یا پیدل کہیں جائے تو اس کا بڑی احتیاط سے تعاقب کریں۔ اسے نظروں سے ہرگز ہرگز اوجھل نہ ہونے دیں۔'' یہ کہہ کر وہ جاوا اینڈ کو کی عمارت کی طرف قدم اٹھانے لگے۔ محمود، فاروق اور فرزانہ نے ان کا ساتھ دیا۔ پھاٹک پر ایک پٹھان چوکیدار بیٹھا تھا۔ عمارت کے گرد ایک کافی اونچی دیوار تھی اور دیوار کے اوپر خاردار

تاروں کی باڑ بھی تھی۔ گویا کوئی چودیوار نہیں پھاند سکتا تھا۔ چوکیدار کے ہاتھ میں دونالی بندوق تھی۔ اس نے انہیں اپنی طرف آتے دیکھ کر بندوق پر گرفت مضبوط کر لی اور سیدھا کھڑا ہو گیا۔

''کیا بات ہے جناب؟''

''میں اس کمپنی کے مالک سے بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''مالک یہاں ہفتے میں صرف ایک دن بیٹھتے ہیں۔ سوموار کے دن۔'' اس نے کہا۔

''منیجر صاحب سے ملاقات ہو سکتی ہے۔''

''جی ہاں، کیوں نہیں۔ آپ اندر چلے جائیے۔ دائیں طرف استقبالیہ لکھا نظر آئے گا۔ وہاں پہنچ کر اپنا کارڈ اندر بھجوائیے۔''

''شکریہ، آؤ بھئی۔'' انہوں نے کہا اور اندر داخل ہوئے۔ استقبالیہ کمرے میں دو چپراسی موجود تھے۔ انہوں نے اپنا کارڈ ان کے آگے کرتے ہوئے کہا۔

''ہمیں منیجر صاحب سے ملنا ہے۔''

''بہت اچھا جناب۔'' ایک نے کہا اور کارڈ لے کر اندرونی دروازے کی طرف بڑھا۔

''عمارت بہت بڑی معلوم ہوتی ہے۔'' انسپکٹر جمشید نے سرسری لہجے میں کہا۔ دوسرے چپراسی نے نظر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا اور بولا:

''جی ہاں، تین منزلہ عمارت ہے۔ پوری ایک منزل نیچے ہے اور دو منزلیں اوپر۔ تینوں منزلوں میں تقریباً تیس کمرے ہیں۔''

''اور کیا ان تیس کے تیس کمروں میں صرف دواؤں کا کاروبار ہوتا ہے۔''

''جی ہاں بالکل۔'' اس نے کہا۔ اسی وقت پہلا چپراسی واپس آ گیا اور ان

سے بولا:

''آئیے جناب، میں آپ کو منیجر صاحب کے کمرے تک پہنچا دوں۔'' وہ اس کے ساتھ اس دروازے میں داخل ہوئے۔

یہ ایک بہت کھلا برآمدہ تھا۔ برآمدے میں ایک طرف سات کمروں کے دروازے تھے جبکہ دوسری طرف تین کمروں کے دروازے تھے؛ گویا یہ کمرے بہت بڑے تھے۔ تمام کمروں میں لوگوں کے کام کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ٹائپ رائٹروں کے چلنے کی آوازیں بھی ان میں شامل تھیں۔ ہر کمرے کے دروازے پر ایک چپراسی موجود تھا۔ ان کے ساتھ اندر آنے والا چپراسی ساتویں کمرے کے دروازے پر رُک گیا اور دروازے پر موجود چپراسی سے بولا:

''یہ کارڈ انہی کا تھا۔''

''ایک منٹ، میں اجازت لے آؤں۔'' اس نے کہا اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ پھر باہر نکل کر انہیں اندر جانے کا اشارہ کیا۔ چاروں اندر داخل ہوئے۔ انہوں نے دیکھا، کمرے میں تین آدمی موجود تھے۔ تین میں سے ایک وہی تھا، جس کا تعاقب کرتے وہ یہاں تک آئے تھے۔ کمرے میں ایک بہت بڑی میز بچھی تھی۔ اس کی دوسری طرف گدے دار کرسی پر منیجر بیٹھا تھا۔ یہ ایک سڈول سے جسم والا سانولے رنگ کا آدمی تھا۔ اس کے دائیں طرف ایک کرسی پر پتلا دبلا اور ننگ منگ سا آدمی بیٹھا تھا۔ اس کا رنگ سفید تھا۔ منیجر کے بالکل سامنے وہی شخص تھا، جس کا تعاقب کرتے ہوئے وہ یہاں پہنچے تھے۔

''تشریف رکھیے جناب، میں حیران ہوں کہ آپ کو ہم سے کیا کام آ پڑا۔'' منیجر نے پر اخلاق مسکراہٹ چہرے پر لاتے ہوئے کہا۔

''شکریہ، میں ایک معاملے کی تفتیش کر رہا ہوں۔ اس سلسلے میں یہاں تک

آنا پڑا۔"

"لیکن کسی معاملے کی تفتیش کا ہم سے کیا تعلق۔" اس نے حیران ہو کر کہا۔

پہلے تو آپ اپنا نام بتایئے اور اس ادارے کے مالک کا بھی۔" انسپکٹر جمشید نے محمود کو اشارہ کرتے ہوئے کہا اور محمود نوٹ بک اور قلم سنبھال کر لکھنے کے لیے تیار ہو گیا۔

"جب تک مجھے یہ معلوم نہ ہو کہ معاملہ کیا ہے، میں نام لکھوانا پسند نہیں کرتا۔"

"بہت بہتر۔ میں بتاتا ہوں۔ آپ لوگ اپنے ادارے کے لیے روئی کی گانٹھیں بھی خریدتے ہیں؟" انہوں ں نے سوال کیا۔

"جی ہاں۔"

"اور کیا آج بھی آپ نے روئی کا کوئی ٹرک منگوایا ہے؟"

"بالکل منگوایا ہے۔"

"میں اس ٹرک کا معائنہ کرنا چاہتا ہوں اور روئی کی ان گانٹھوں کا بھی جو اس ٹرک پر لادی گئی ہیں۔" وہ بولے۔

"آخر معاملہ کیا ہے؟"

"میں بھی آپ کو اس وقت تک کچھ نہیں بتا سکتا جب تک کہ ٹرک اور گانٹھوں کا معائنہ نہ کر لوں۔" انہوں نے قدرے جھلا کر کہا۔

"بہت بہتر۔ مسٹر عباس شاہین، ذرا ان لوگوں کو ٹرک اور روئی کی گانٹھیں دکھلائیں۔"

"جی بہتر۔" اس آدمی نے کہا، جس کا تعاقب کرتے ہوئے وہ یہاں تک آئے تھے۔

مینجر کے منہ سے اس شخص کا نام عباس شاہین سن کر ان کی حیرت کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔

"چلیے جناب۔" انہوں نے عباس شاہین کی آواز سنی، اگر وہ ابھی کچھ اور نہ بولتا تو نہ جانے وہ کب تک حیرت میں غرق رہتے۔

کمرے سے نکلے تو انسپکٹر جمشید نے محمود کا ہاتھ دبا دیا۔ اس نے فاروق کا زو پکڑ کر دبا دیا۔ فاروق نے یہی عمل فرزانہ کے ساتھ کیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ان بوں کو عباس شاہین سے کوئی سوال نہیں کرنا تھا، بلکہ بالکل خاموش رہنا تھا۔ برآمدے سے ہو کر وہ بیرونی دروازے کی طرف آئے۔ یہاں سے دائیں طرف نچلی منزل ہے پہنچنے کے لیے راستہ تھا۔ یہ راستہ بہت چوڑا اور ڈھلوان تھا۔ وہ سمجھ گئے کہ ڈھلان استہ گاڑیوں کے لیے بنایا گیا تھا؛ ورنہ سیڑھیاں بھی بنائی جا سکتی تھیں۔ وہ ڈھلوان استہ طے کرنے لگے۔ عباس شاہین ان کے آگے آگے چل رہا تھا۔ ایک بار پھر ان کے دل تیز تیز دھڑک رہے تھے۔ ان کا جی چاہ رہا تھا، کسی طرح جلد از جلد وہ ٹرک نظر آ جائے، جس کی تلاش میں وہ صبح سے مارے مارے پھر رہے تھے۔ ڈھلوانی راستہ ختم ہوا تو نیچے انہیں ایک کھلا میدان نظر آیا۔ اس میں کچھ کاریں کھڑی تھیں۔ ایک طرف ایک ٹرک بھی کھڑا تھا۔ انہوں نے دیکھا ٹرک کا رنگ سرخ اور نیلا تھا۔ اب انہیں ڈرائیور محمد شفیع کی باتوں پر یقین آ گیا۔ اس نے غلط نہیں کہا تھا کہ اس کے آگے ایک ٹرک تھا اور اس ٹرک پر روئی کی گانٹھیں لدی تھیں اور یہ کہ اس کا رنگ سرخ اور نیلا تھا۔ اب سرخ اور نیلا ٹرک ان کے سامنے تھا۔ انسپکٹر جمشید بے تابی کے عالم میں ٹرک پر سوار ہو گئے اور اس کے ایک ایک حصے کا جائزہ لینا شروع کیا۔ محمود، فاروق اور فرزانہ نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ لیکن عباس شاہین نیچے ہی کھڑا انہیں حیرت بھری نظروں سے دیکھتا رہا۔

''آخر آپ کیا دیکھ رہے ہیں، کچھ پتا بھی تو چلے؟'' اس سے رہا نہ گیا، پوچھ بیٹھا۔

''ابھی بتاتے ہیں، ذرا دیر ٹھہریں۔'' انسپکٹر جمشید بولے۔

انہوں نے پورے ٹرک کو دیکھ ڈالا، لیکن بیگم جمشید کا کوئی سراغ نہ ملا۔ نہ ان کے کپڑوں کی کوئی دھجی ٹرک پر ملی، نہ کوئی اور چیز۔ آخر تنگ آ کر وہ نیچے اُتر آئے اور بولے:

''ہمیں ان گانٹھوں تک لے چلیے۔''

''آئیے، لیکن میں حیران ہوں، آپ کر کیا رہے ہیں؟''

''بہت جلد آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ میں کیا کر رہا ہوں اور کیا چاہتا ہوں۔ آپ پریشان نہ ہوں۔'' انہوں نے اسے تسلی دی۔

عباس شاہین انہیں لے کر اور آگے بڑھا۔ بڑے میدان میں ایک طرف روئی کی گانٹھیں پڑی تھیں۔ انہوں نے ایک ایک گانٹھ کو بغور دیکھا، لیکن کسی گانٹھ پر بھی کوئی ایسا نشان نہیں ملا جس سے معلوم ہوتا کہ بیگم جمشید اس ٹرک پر آ گری تھیں اور انہوں نے ان گانٹھوں کے اوپر سفر کیا تھا۔

ایک بار پھر مایوسی نے ان پر زوردار حملہ کیا۔ انہوں نے بڑی مشکل سے خود کو اس کے وار سے بچایا۔ انسپکٹر جمشید عباس شاہین کی طرف مڑے۔

''مسٹر عباس، واپس منیجر صاحب کے کمرے میں چلیے۔ اب باقی بات چیت وہیں ہوگی۔''

''آئیے۔'' اس نے کہا اور پھر ان کے آگے آگے چلنے لگا۔ وہ دوبارہ منیجر کے کمرے میں داخل ہوئے تو اس نے سوالیہ نظروں سے عباس شاہین کی طرف دیکھا۔

''میں کچھ نہیں سمجھ سکتا جناب کہ انسپکٹر صاحب کی آمد کا مقصد کیا ہے۔''

''میں ابھی بتاتا ہوں۔ ٹرک نمبر ایف کے ۳۱۰ آپ نے کس سے خریدا تھا؟''

''اس کا جواب مسٹر عباس شاہین دیں گے، کیونکہ ادارے کے لیے چیزوں کی خرید و فروخت انہیں کے ذمے ہے۔'' منیجر نے کہا۔

''خوب، چلیے آپ بتا دیں۔'' وہ اس کی طرف مڑے۔

''میں نے یہ ٹرک شیخ برادرز سے خریدا تھا۔ وہ دواؤں کی ایک فرم ہے۔ ہمیں اکثر ان کی کمپنی سے بھی دوائیں منگوانا پڑتی ہیں۔ اس لیے میرا ان کے ہاں آنا جانا ہے۔ تقریباً چھ ماہ پہلے کی بات ہے کہ میں نے ان کی فرم کے باہر ایک ٹرک دیکھا۔ اس پر برائے فروخت لکھا ہوا تھا۔ ہمارے ادارے کو ایک ٹرک کی ضرورت تھی، لیکن ادارہ نیا ٹرک خریدنے کی بجائے کوئی سیکنڈ ہینڈ ٹرک خریدنے کے حق میں تھا؛ چنانچہ میں نے اس ٹرک کا سودا کر لیا۔ اس سلسلے میں میری ان کے اکاؤنٹنٹ سے بات ہوئی تھی۔''

''اور پھر آپ نے ٹرک خرید لیا؟'' انسپکٹر جمشید نے پوچھا۔

''جی ہاں۔''

''لیکن ٹرک کی خریداری کے لیے شیخ برادر کے اکاؤنٹنٹ سے ہوٹل ذی شان میں ملاقات کیوں کی گئی۔''

''یہ تجویز خود حامد غوری صاحب کی تھی، میں نے جب ان سے دفتر میں بات کرنا چاہی تو اس نے کہہ دیا کہ شام کو ہوٹل ذی شان میں بات کر لیں گے۔ دراصل ہم دونوں کو ہوٹل ذی شان کا کھانا بہت پسند ہے۔'' اس نے کہا۔

''خیر یہ تو ہوا، لیکن آپ نے خریداری کے معاہدے پر اپنا پتا غلط کیوں لکھوایا؟'' انہوں نے تیز لہجے میں کہا۔

"پتا غلط لکھوایا، کیا مطلب؟" منیجر نے چونک کر کہا۔

"میں نے پتا غلط نہیں لکھوایا تھا۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ میں نے فرم کی بجائے اپنا ذاتی پتا لکھوا دیا تھا۔"

"اور آپ کا ذاتی پتا ۱۳ گرین سکوائر ہے؟" انسپکٹر جمشید بولے۔

"جی ہاں، بالکل یہی پتا ہے میرا۔"

"جب کہ یہ بات بالکل غلط ہے۔ آپ کا پتا یہ نہیں۔ اس پتے پر تو کوئی شیروانی صاحب رہتے ہیں۔ تیرہ نمبر کی کوٹھی ان کی ہے۔"

"اوہ، میں سمجھا، تو آپ سب کچھ معلوم کرنے کے بعد یہاں آئے ہیں، لیکن میں ابھی تک یہی نہیں سمجھ سکا کہ آپ یہ سب کیوں معلوم کرتے پھر رہے ہیں؟" عباس شاہین نے حیران ہو کر کہا۔

"میں نے کہا، ابھی بتاتا ہوں۔ پہلے یہ بتائیے کہ آپ نے غلط پتا کس طرح نہیں لکھوایا؟"

"بات دراصل یہ ہے جناب کہ میری کوٹھی کا نمبر ۱۳۔اے گرین سکوائر ہے۔ اب یا تو میں اے لکھوانا بھول گیا یا حامد غوری صاحب لکھنا بھول گئے۔ ۱۳۔اے صرف ۱۳ کے بالکل مخالف سمت میں ہے، ایک مرتبہ ڈاکیا تیرہ نمبر کے خط مجھے دے گیا تھا۔ میں نے انہیں واپس کر دیا تھا۔"

"تو پھر شیروانی نے ہمیں یہ بات کیوں نہیں بتائی کہ یہاں ایک کوٹھی تیرہ اے بھی ہے۔"

"انہیں شاید یہ بات معلوم ہی نہیں ہے، نہ وہ مجھ سے واقف ہیں، لیکن چونکہ میرے پاس خط آیا تھا، اس لیے میں ان کا نام بھی جانتا ہوں۔ یوں بھی ۱۳۔اے والے کو تو یہ بات معلوم ہو سکتی ہے کہ کوئی ۱۳ نمبر بھی ہوگا، لیکن صرف ۱۳ والے کو یہ

معلوم نہیں ہو سکتا کہ کوئی تیرہ اے بھی ہے۔" اس نے پوری وضاحت سے جواب دیا۔

"انسپکٹر صاحب، میرا خیال ہے، اب آپ کا اطمینان ہو گیا ہوگا۔ اب آپ بھی ہمارا اطمینان کرا دیجیے۔ آخر چکر کیا ہے۔" منیجر نے کہا۔

"ہاں میں بتاتا ہوں۔" انسپکٹر جمشید نے بجھے بجھے لہجے میں کہا۔

ایک بار پھر انہیں تفتیش کی گاڑی فیل ہوتی معلوم ہو رہی تھی۔ اب تک تو وہ یہی خیال کر رہے تھے کہ عباس شاہین فراڈ ہے، کوئی جرائم پیشہ ہے، لہٰذا اس نے بیگم جمشید کو کہیں چھپا دیا ہے، یا قید کر دیا ہے تاکہ اس کے بارے میں انہیں کچھ معلوم نہ ہو سکے۔ لیکن اب ان کے پاس شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں رہی تھی۔ انہوں نے تفصیل سے ساری بات انہیں سنا دی۔

"اوہو، تو یہ بات ہے۔ بہت افسوس ناک واقعہ ہوا آپ کے ساتھ۔ ہم کوئی اور خدمت کر سکتے ہیں؟"

"جی نہیں شکریہ۔" یہ کہہ کر انسپکٹر جمشید اٹھ کھڑے ہوئے۔ باہر نکلے تو محمود، فاروق اور فرزانہ کے چہرے دھواں ہو رہے تھے۔

"ابا جان، یہ کیا ہوا؟" فرزانہ نے رو دینے والے انداز میں کہا۔

"دیکھو فرزانہ، رو نہ دینا۔ اگر ہم نے حوصلہ ہار دیا، تو ہم تمہاری امی کو بھی نہیں پا سکیں گے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے، لیکن اب آپ کیا کہتے ہیں۔ امی جان آخر کہاں ہو سکتی ہیں؟"

"وہ کہیں بھی ہوں، میں ایک بات سو فیصد یقین سے کہہ سکتا ہوں۔" انسپکٹر جمشید نے کہا۔

"یہ کہ تمہاری امی زندہ و سلامت ہیں۔"

☆☆☆

کمپنی کی سیر

چند لمحے کے لیے خاموشی چھائی رہی۔ کیونکہ ہر کوئی انسپکٹر جمشید کے خیال کے یقینی ہونے کے بارے میں سوچنے لگا تھا۔

''آپ یہ بات اس قدر یقین سے کس طرح کہہ سکتے ہیں؟'' فرزانہ نے پرامید لہجے میں کہا۔

''اس طرح کہ اگر بیگم اللہ کو پیاری ہوگئی ہوتیں تو اس وقت تک ہمیں ان کی لاش مل چکی ہوتی یا اگر وہ چٹان سے سڑک پر یا کھائی میں گری ہوتیں تو بھی ان کے بارے میں اس وقت تک ہمیں کوئی نہ کوئی اطلاع مل چکی ہوتی۔ اس لیے میں سو فیصد یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ زندہ ہیں۔ وہ کہاں ہیں، یہ میں نہیں جانتا۔ ہم ان کی تلاش جاری رکھیں گے۔ یا تو انہیں پالیں گے یا تلاش کرتے کرتے مر جائیں گے۔'' ان کے لہجے میں عزم تھا، امید تھی، حوصلہ تھا۔

جاوا اینڈ کو کی عمارت سے نکل کر جمشید نے اکرام کو وائرلیس پر چند ہدایات دیں اور ان کی طرف مڑتے ہوئے بولے:

''اب تک میں اپنی عقل استعمال کرتا رہا ہوں، تم میرا ساتھ دیتے رہے ہو، اب میں تمہارا ساتھ دوں گا اور تم عقل استعمال کرو گے۔''

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ابا جان۔'' فرزانہ نے پریشان ہو کر کہا۔

''بھلا ان حالات میں ہم کیا عقل استعمال کر سکتے ہیں۔ ہماری تو عقلیں خبط ہو گئی ہیں۔'' محمود نے کہا۔

''بہتر یہی ہے کہ آپ ہی ہمیں اپنے ساتھ چلائیں۔'' فاروق نے کہا۔

''چلو خیر، تم یہ بتاؤ کہ اب ہم کیا کریں؟'' انہوں نے کہا۔

''یہی تو الجھن ہے۔ اب تو ہمارے پاس تفتیش کا کوئی راستہ بھی نہیں رہا۔'' محمود بولا۔

''میرا خیال ہے ہمیں سب سے پہلے عباس شاہین کے بیان کی تصدیق کر لینی چاہیے۔ یعنی کیا وہ واقعی ۱۳۔ اے گرین سکوائر میں رہتا ہے یا نہیں۔ دوسرے یہ کہ حامد غوری اور عباس شاہین میں کیا تعلق ہے؟'' فرزانہ نے کہا۔

''تعلق تو وہ خود ہی بتا چکا ہے۔'' فاروق نے اعتراض کیا۔

''مجھے یہ بات کچھ عجیب سی لگتی ہے، ان دونوں نے ٹرک کی خرید و فروخت کی بات ہوٹل ذی شان میں کی تھی۔ یہ گفتگو تو وہ دفتر کے کمرے میں بھی کر سکتے تھے۔ آخر کو یہ فرم کا ٹرک تھا۔'' فرزانہ بولی۔

''بات تو ٹھیک ہی کہی تم نے۔'' محمود بولا۔

''خیر، ہم اس پر بھی غور کریں گے۔ پہلے عباس شاہین کے گھر کے بارے میں تصدیق کر لیں۔'' انسپکٹر جمشید نے کہا اور جیپ میں سوار ہو گئے۔ گرین سکوائر پہنچ کر انہیں فوراً ہی یہ معلوم ہو گیا کہ وہاں ایک عدد ۱۳۔ اے کوٹھی نمبر بھی تھی۔ وہ واپس ہونے کے لیے تیار ہی تھے کہ انسپکٹر جمشید کچھ سوچ کر رک گئے اور ان کے قدم شیروانی کی طرف اٹھنے لگے۔ شیروانی انہیں اس وقت بھی اپنی کوٹھی میں ہی مل گئے۔ انہیں دوبارہ دیکھ کر اس کے چہرے پر حیرت کے آثار نمودار ہو گئے۔

''آپ لوگ پھر آ گئے۔'' اس کے منہ سے نکلا۔

"آپ جانتے ہی ہیں۔ ضرورت مند دیوانہ ہوتا ہے، سو اس وقت ہم بھی دیوانے ہیں۔ کیا آپ کو یہ بات معلوم نہیں تھی کہ یہاں ایک کوٹھی ۱۳۔اے نمبر بھی ہے؟"

"تیرہ اے، تو کیا یہاں اس نمبر کی کوئی کوٹھی موجود ہے۔"

"جی ہاں، بالکل ہے اور اس کوٹھی میں عباس شاہین نام کا ہی آدمی رہتا ہے۔" انہوں نے کہا۔

"پھر تو واقعی مجھے یہ بات معلوم نہیں تھی۔"

"خیر کوئی بات نہیں، اس میں آپ کا کیا قصور؟" انہوں نے شیروانی کا شکریہ ادا کیا اور واپس روانہ ہوئے۔ اچانک انسپکٹر جمشید چلتے چلتے رک گئے۔ انہوں نے محمود، فاروق اور فرزانہ پر ایک نظر ڈالی، پھر بولے۔

"میں ایک چھوٹا سا حساب لگانا چاہتا ہوں۔"

"حساب، ہم سمجھے نہیں۔" محمود نے حیران ہو کر کہا۔

"بھئی، حساب کا مطلب تو حساب ہی ہوتا ہے۔" یہ کہہ کر وہ جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئے اور جیب سے قلم کاغذ نکال کر اس پر کچھ ہندسے لکھنے لگے۔ محمود، فاروق اور فرزانہ کو بہت حیرت ہوئی کہ یہ سوال نکالنے کا کونسا موقع ہے یا کسی چیز کا حساب کرنے کی کیا ضرورت پیش آ گئی ہے؛ تاہم وہ صبر سے بیٹھے رہے۔ آخر انسپکٹر جمشید نے قلم جیب میں رکھ لیا اور کاغذ کے پرزے پرزے کر کے ہوا میں اڑا دیے۔

"چلو بھئی، میں حساب لگا چکا ہوں۔"

"اب کہاں کا ارادہ ہے؟"

"پہلے تو ہمیں کچھ کھا لینا چاہیے۔ ہوٹل سے جو چیزیں پیک کرا لائے تھے۔ وہ ابھی تک یوں ہی پڑی ہیں۔ اس کے بعد ہم اپنی مہم پر نکلیں گے۔" انہوں نے

کہا۔ جیپ میں بیٹھے بیٹھے انہوں نے دو دو چار چار لقمے کھائے اور پھر انسپکٹر جمشید نے جیپ اسٹارٹ کر دی۔

"آپ نے بتایا نہیں، کہاں جانے کا ارادہ ہے؟"

"بس دیکھتے جاؤ۔" وہ پراسرار انداز میں بولے۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے آپ کو کوئی بات سوجھ گئی ہے۔" فرزانہ نے ان کی طرف بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں، تمہارا خیال ٹھیک ہی ہے۔" وہ دھیمے انداز میں بولے۔

"تو کیا ہم کامیابی کے قریب ہیں؟"

"ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔" وہ بولے۔

"کیا آپ نے کسی جرم کی بو سونگھ لی ہے؟" فرزانہ نے پوچھا۔

"جرم کی بو۔" انسپکٹر جمشید بے خیالی کے عالم میں بولے پھر فرزانہ کی طرف دیکھ کر کہا۔

"ہاں، تم بھی سمجھ سکتے ہو۔"

"لیکن ابا جان، ہمیں تو دور دور تک کسی جرم کا کوئی نشان نہیں ملا۔ عباس شاہین پر اس وقت ضرور شک گزرا تھا۔ جب تیرہ نمبر کوٹھی اس کی ثابت نہیں ہوئی تھی، لیکن بعد میں جب جاوا اینڈ کو کے دفتر میں وضاحت کی اور بتایا کہ اس کی کوٹھی کا نمبر دراصل ۱۳۔اے ہے اور اس نمبر کی کوٹھی واقعی موجود ہونے کے بارے میں بھی معلوم ہو گیا تو اس پر سے شک ایک دم رفع ہو گیا۔"

"ہاں، یہ ٹھیک ہے۔ لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی اور وہ یہ کہ آخر اس شخص عباس شاہین کی کتنی تنخواہ ہے جو اتنی شاندار کوٹھی میں رہتا ہے۔" وہ بولے۔

"ہو سکتا ہے، کوٹھی اس کی نہ ہو۔ اس نے کرائے پر لے رکھی ہو۔"

"اس صورت میں بھی اس کا کرایہ دس ہزار روپے تو اسے دینا ہی پڑتا ہوگا۔ آخر جاوا اینڈ کو اسے کتنی تنخواہ دیتی ہے۔"

"تو کیا آپ یہ خیال کر رہے ہیں کہ وہ ناجائز ذرائع سے دولت کما رہا ہے۔"

"ہاں، میرا یہی خیال ہے۔" وہ بولے۔

"سوال یہ ہے ابا جان کہ اس کے ناجائز دولت کمانے سے ہماری امی جان کی گمشدگی کا کیا تعلق ہے۔" فاروق نے بے چینی کے عالم میں کہا۔

"تمہاری امی، جیسا کہ ہمارا خیال ہے چٹان سے سیدھی اس کے ٹرک پر آ گری تھیں۔ ٹرک سیدھا جاوا اینڈ کمپنی تک آیا ہوگا۔ ہو سکتا ہے، انہوں نے عباس شاہین کے کچھ الفاظ سن لیے ہوں۔ جن کی وجہ سے وہ قانون کی گرفت میں آ سکتا ہے۔ اوہو، ہم نے یہ تو معلوم کیا ہی نہیں۔" اچانک انسپکٹر جمشید چونک اٹھے۔

"کیا معلوم نہیں کیا؟" فرزانہ نے فوراً کہا۔

"یہ کہ اس وقت ٹرک کون چلا رہا تھا۔ ڈرائیور کے ساتھ جاوا اینڈ کمپنی کا کوئی اور آدمی تھا یا نہیں۔"

"واقعی، یہ معلوم کرنا بہت ضروری تھا۔"

"خیر کوئی بات نہیں۔ ہم جاوا اینڈ کمپنی تک پہنچ ہی گئے ہیں۔ ابھی معلوم کر لیتے ہیں۔"

انہوں نے چونک کر نظریں اٹھائیں۔ جاوا اینڈ کمپنی کا بورڈ ان کی نظروں کے عین سامنے تھا۔

☆☆

جاوا اینڈ کمپنی کے منیجر نے ان کی طرف دیکھ کر حیرت سے پلکیں جھپکائیں

اور پھر بولا:

"کیا کوئی بات معلوم کرنے سے رہ گئی ہے جناب؟"

"جی ہاں، کیا عباس شاہین موجود ہیں؟"

"ضرور موجود ہیں۔ بلواؤں انہیں۔"

ایک منٹ ٹھہریے، پہلے میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ ٹرک پر کون کون سوار تھا۔ میرا مطلب ہے ڈرائیور کے علاوہ۔"

"ڈرائیور کے علاوہ خود عباس شاہین صاحب موجود تھے۔ میں بتا چکا ہوں کہ کمپنی کے لیے مختلف چیزوں کی خرید و فروخت ان کے ذمے ہے۔"

اس سلسلے میں انہیں اکثر خود بھی ساتھ جانا پڑتا ہے۔"

"بہت خوب، آپ کی کمپنی مسٹر عباس شاہین کو کتنی تنخواہ دیتی ہے۔"

"تقریباً پانچ ہزار۔" اس نے کہا۔

"شکریہ، اب عباس شاہین کو بلائیے۔" انہوں نے کہا اور منیجر نے گھنٹی بجا کر چپراسی کو ہدایات دیں۔ جلد ہی عباس شاہین اندر داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر بھی حیرت کے آثار طاری تھے۔

"مسٹر عباس، ۱۳۔ اے آپ کی اپنی کوٹھی ہے۔"

"جی۔ جی ہاں۔" اس نے کہا۔

بالکل نئی معلوم ہوتی ہے۔ میرا خیال تھا آپ نے کرائے پر لے رکھی ہوگی۔ خیر یہ جان کر خوشی ہوئی کہ کوٹھی آپ کی اپنی ہے۔ آج ڈرائیور کے ساتھ ٹرک پر آپ بھی سوار تھے۔ کیا آپ یہ بات یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ ٹرک پر کوئی عورت نہیں گری تھی۔"

"جی ہاں، میں یقین سے کہہ سکتا ہوں۔" اس نے کہا۔

"اس ملازمت کے علاوہ آپ کوئی اور کام بھی کرتے ہیں۔"

"جی نہیں، میرے دن رات اسی ادارے کے لیے وقف ہیں۔" اس نے قدرے جھنجھلا کر کہا۔

"آپ شاید میرے سوالات سے پریشان ہو گئے ہیں۔"

"جی نہیں تو۔ بھلا میں کیوں پریشان ہونے لگا۔"

"اچھی بات ہے۔ اب میں پھر کوٹھی کی طرف آتا ہوں۔ بلکہ اس سے پہلے میں یہ سوال کروں گا کہ آپ کو یہاں ملازمت کرتے کتنا عرصہ ہو گیا ہے۔"

"تقریباً دس سال۔" اس نے کہا۔

"اس سے پہلے آپ کہاں کام کرتے تھے؟"

"میں دواؤں کا سیلز مین تھا۔ دکانوں پر سے آرڈرز وصول کیا کرتا تھا۔ اس پر مجھے کمیشن ملتا تھا۔"

"اور اس کام سے یہ کام آپ کو زیادہ بہتر معلوم ہوا ہوگا۔"

"جی ہاں، اب مجھے ایک ایک دکان پر نہیں جانا پڑتا۔"

"ان دنوں آپ کیا کما لیتے تھے؟"

"آخر آپ مجھ سے یہ ذاتی قسم کے سوال کیوں کر رہے ہیں؟" اب تلملا اٹھا۔

"میرے سوال کا جواب دیں۔" انسپکٹر جمشید کا لہجہ سخت ہو گیا۔

"تقریباً دو ہزار روپے ماہانہ۔"

"آپ کی کوٹھی پر کتنا روپیہ خرچ ہوا ہوگا۔"

"سات آٹھ لاکھ روپے تو لگ ہی گئے ہیں۔"

"کیا آپ نے بینک سے ادھار لیا تھا؟"

"جی نہیں، میں نے بچت کر کے یہ کوٹھی تعمیر کرائی ہے۔"

"خوب، یہاں آپ کی تنخواہ پانچ ہزار ہے۔ جو کہ شروع میں ضرور کم رہی ہوگی۔ اس سے پہلے آپ تقریباً دو ہزار روپے ماہانہ کمایا کرتے تھے۔ پھر آپ سات آٹھ لاکھ روپے کی کوٹھی کس طرح تعمیر کرانے میں کامیاب ہو گئے۔ کیا آپ کو اپنے باپ دادا کی جائیداد وغیرہ بھی ملی تھی۔"

"جی نہیں، میں نے کہا نا، اپنی آمدنی کا زیادہ حصہ میں بچاتا رہا ہوں۔" اس نے چیں بچیں ہو کر کہا۔

"اچھی بات ہے، آپ کے گھر کے افراد کتنے ہیں؟"

"سات افراد ہیں۔ چار بچے، دو ہم میاں بیوی اور ایک میری والدہ۔" اس نے بتایا۔

"منیجر صاحب، مہربانی کر کے اس ڈرائیور کو بلائیے۔"

"ضرور لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آپ کا ان سوالات سے کیا مقصد ہے؟"

"مقصد بھی ابھی معلوم ہو جائے گا۔ فکر نہ کریں۔"

منیجر نے ایک بار پھر گھنٹی بجائی۔ جلد ہی ایک لمبے تڑنگے جسم کا آدمی اندر داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر سختی کے آثار تھے۔ آنکھیں چھوٹی تھیں، جن میں تیز چمک تھی۔ چہرے کے نقوش غنڈوں جیسے تھے۔

"جانباز خان، یہ محکمہ سراغرسانی کے انسپکٹر جمشید ہیں۔ تم سے کچھ پوچھنا چاہتے ہیں۔ ان کے سوالوں کے جواب دو۔ بیٹھ جاؤ۔" منیجر نے تعارف کراتے ہوئے کہا۔

"بہت اچھا ساب۔" اس نے کہا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

"آج جب ٹرک پہاڑی سڑک سے گزر کر شہر کی طرف آ رہا تھا، اس وقت

اس پر روئی کی گانٹھیں لدی ہوئی تھیں۔"

"جی ہاں جناب۔"

"تم نے ٹرک پر کوئی چیز گرنے کی آواز سنی تھی۔"

"نہیں میں نے کوئی آواز نہیں سنی۔ ویسے بھی میں ذرا اونچا سنتا ہوں۔"
اس نے کہا۔

"ٹرک سیدھا کمپنی میں آیا تھا یا راستے میں بھی کہیں رکا تھا۔"

"ہم سیدھے یہیں آئے تھے۔"

"تم نے ٹرک پر ترپال ڈال رکھی تھی؟"

"جی نہیں، بارش کے کوئی آثار نہیں تھے۔ اس لیے میں نے ترپال ڈالنے کی ضرورت نہیں محسوس کی۔"

"ٹرک جب کمپنی کی عمارت میں داخل ہوا، میرا مطلب ہے نچلی منزل کے میدان میں تو اس وقت تمہاری عباس شاہین سے کیا گفتگو ہوئی تھی؟"

"کوئی گفتگو نہیں ہوئی۔ میں مزدوروں کو بلانے چلا گیا تھا۔ پھر مزدوروں نے گانٹھیں اتاری تھیں۔ عباس شاہین صاحب اور میں ان کے پاس ہی کھڑے رہے تھے۔"

"اور گانٹھوں کے درمیان کوئی عورت نہیں ملی۔"

"جی نہیں۔"

"ٹھیک ہے، تم جا سکتے ہو۔" انہوں نے کہا، پھر ڈرائیور کے جانے کے بعد منیجر سے بولے:

"میں آپ کی کمپنی کی سیر کرنا چاہتا ہوں۔"

"کیا مطلب؟" منیجر نے چونک کر کہا۔

"مطلب یہ کہ میں کمپنی کی تلاشی لینا چاہتا ہوں۔"

"لیکن کس الزام کے تحت؟"

"یہاں ایک عورت کو قید کر کے رکھا گیا ہے۔" وہ بولے۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں جناب، یہ تو ہم پر بہت بڑا الزام ہے۔"

"الزام ہی سہی، آپ یہ بتائیے کہ تلاشی دینے پر آمادہ ہیں یا نہیں؟"

"بھلا میری کیا جرأت کہ دم مار سکوں، لیکن ملکی قانون کے مطابق آپ کو تلاشی کے وارنٹ حاصل کرنا ہوں گے۔"

"میں وارنٹ کا پابند نہیں، ہاں، اگر یہاں سے کچھ نہ ملا تو میں آپ سے معافی مانگ لونگا۔ آپ معافی کو نا کافی خیال کرتے ہوں تو ہرجانے کا دعویٰ مجھ پر کر سکتے ہیں۔"

"بہتر تو یہی تھا کہ آپ وارنٹ حاصل کر لیتے۔"

"اچھی بات ہے، ابھی لیجیے۔" انہوں نے کہا اور فون پر آئی جی صاحب کے نمبر گھمائے۔ سلسلہ فوراً ہی مل گیا۔

"سر میں جمشید بول رہا ہوں، میں فوری طور پر جاوا اینڈ کو کی تلاشی کا وارنٹ چاہتا ہوں۔"

"لیکن تمہیں وارنٹ کی کیا ضرورت ہے۔ اپنا خصوصی اجازت نامہ کیوں استعمال نہیں کرتے؟ اور ہاں، بیگم کا کیا رہا؟"

"انہی کی تلاشی کے سلسلے میں یہ اقدام کر رہا ہوں۔ خصوصی اجازت نامہ اس لیے دکھانا مناسب نہیں سمجھا کہ یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔"

"لیکن اگر بھابی کو حبس بیجا میں رکھا گیا ہے تو یہ تمہارا ذاتی معاملہ نہیں رہ جاتا۔"

"تو پھر کیا میں اجازت نامہ ہی استعمال کروں؟"

"بالکل، تمہارا شک بلاوجہ نہیں ہو سکتا۔"

"جی بہتر۔" انہوں نے کہا اور پھر جیب سے اپنا خصوصی اجازت نامہ نکال کر دکھایا۔ منیجر نے اسے حیرت زدہ ہو کر پڑھا اور پھر بولا:

"ٹھیک ہے جناب، آپ انہیں ساتھ لے جائیں۔" اس نے کہا۔

اور وہ عباس شاہین کو ساتھ لے کر تلاشی کی مہم پر نکل کھڑے ہوئے۔ عمارت تقریباً تیس کمروں پر مشتمل تھی۔ ان میں بیشتر کمروں میں دواؤں کی پیٹیاں ہی پیٹیاں بھری پڑی تھیں۔ یہ دوائیں مختلف کمپنیوں کی تھیں۔ تقریباً دس کمروں میں دفتری کام کرنے والے ملازمین کام کرتے نظر آئے۔ سب سے آخر میں وہ نچلی منزل میں آئے، جہاں وہ ٹرک اب تک کھڑا تھا۔ روئی کی گانٹھیں بھی موجود تھیں۔ اچانک گانٹھوں کے قریب رک گئے۔ انہوں نے عباس شاہین کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"مسٹر عباس شاہین، یہ فرم تو دواؤں کے آرڈروں کی تعمیل کرتی ہے۔ اسے روئی کی گانٹھوں کی کیا ضرورت ہے۔"

نہ صرف عباس شاہین نے بلکہ محمود، فاروق اور فرزانہ نے بھی ان کی طرف چونک کر دیکھا، کیونکہ ابھی تک یہ سوال ان کے ذہنوں میں بھی پیدا نہیں ہوا تھا۔ پھر وہ عباس شاہین کی طرف دیکھنے لگے۔ آخر اس نے کہا۔

"روئی کو ہم پیکنگ کے کام میں لاتے ہیں۔"

"کیا مطلب، دوسری کمپنیوں کی جو پیٹیاں آپ کو موصول ہوتی ہیں، کیا ان کی پیکنگ میں روئی استعمال نہیں ہوتی کہ آپ کو روئی لگانا پڑتی ہے۔" انہوں نے حیران ہو کر کہا۔

"ہم جو پیٹیاں منگاتے ہیں، ان کی پیکنگ میں بھی روئی استعمال ہوتی ہے۔ یا پھر کاغذات کی کترنیں، لیکن ہمیں یہاں آرڈرز نئے سرے سے پیٹیوں میں بھرنے پڑتے ہیں اور روئی لگانا پڑتی ہے۔"

"ہوں، خیر چلیے، ذرا نچلی منزل کی سیر بھی کر لیں۔"

نچلی منزل کے تین کمروں میں انہیں سوائے دواؤں کی پیٹیوں کے اور کچھ نظر نہ آیا۔ پانچ کمروں میں مشینیں لگی نظر آئیں۔ ان مشینوں پر کاریگر کام کر رہے تھے۔

"ان مشینوں پر کیا تیار ہو رہا ہے؟"

"ہماری کمپنی کی اپنی بھی چند دوائیں ہیں۔ وہ دوائیں ان مشینوں پر تیار ہوتی ہیں۔"

"یہ بات پہلی بار معلوم ہوئی ہے۔ آپ نے یا منیجر صاحب نے نہیں بتائی تھی۔ خیر، آیئے، باقی کے دو کمرے بھی دیکھ لیں۔"

یہ کہہ کر وہ نویں کمرے میں داخل ہوئے۔ اس کمرے میں خالی شیشیوں کے ڈبے چھت تک بھرے ہوئے تھے۔

"ان شیشیوں میں آپ اپنے ہاں تیار کردہ دوائیں بھرتے ہیں؟"

"جی ہاں۔" اس نے جواب دیا۔

"آیئے، اب اوپر چلیں۔ آپ کا کاروبار تو بالکل صاف ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کو تلاشی کی زحمت دی۔"

"کوئی بات نہیں جناب۔" عباس شاہین نے کہا۔

"اب تک یہ بات معلوم نہیں ہو سکی کہ اس کمپنی کا مالک کون ہے؟ آپ کی کمپنی جو دوائیں تیار کرتی ہے ان کے فارمولے کس کے لکھے ہوئے ہیں؟"

"خود ہماری کمپنی کے مالک کے۔ ان کا نام ڈاکٹر یارڈلے ہے۔" عباس شاہین نے کہا۔

"میں ان سے کہاں مل سکتا ہوں۔"

"وہ یہاں تو چار پانچ ماہ بعد ہی کبھی آتے ہیں۔ عام طور پر ملک سے باہر

رہتے ہیں۔'' اس نے بتایا۔

''ان دنوں بھی ملک سے باہر ہیں۔''

''جی ہاں۔'' اس نے کہا۔

''بہت خوب، آپ کے ہاں کی تیار کردہ دوائیں کیسی فروخت ہو رہی ہیں۔''

''بہت اچھی جا رہی ہیں۔'' اس نے خوش ہو کر کہا۔

''وہ ایک بار پھر منیجر صاحب کے کمرے میں آئے۔ معذرت کی اور پھر اٹھتے ہوئے بولے:

''آپ اپنی کمپنی کی دواؤں کی فہرست بھی مرحمت کر دیں۔ میں بھی انہیں استعمال کر کے دیکھوں گا۔''

''جی ہاں، کیوں نہیں۔'' اس نے کہا اور دراز میں سے فہرست نکال کر ان کی طرف بڑھا دی۔

اس کے بعد وہ ان سے رخصت ہو کر باہر نکلے۔ جیپ میں بیٹھے اور دفتر کی طرف روانہ ہو گئے۔ محمود، فاروق اور فرزانہ کے چہرے دھواں ہو رہے تھے۔ اب تک کی بھاگ دوڑ کے بعد بھی انہیں بیگم جمشید کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا اور اب وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے تھے کہ ان کی تفتیش بالکل غلط سمت میں جا رہی تھی۔ بیگم جمشید ٹرک نمبر الف کے تین سو دس پر نہیں گری تھیں۔

دفتر کے راستے میں دواؤں کی ایک دکان تھی۔ اس کا مالک انسپکٹر جمشید سے اچھی طرح واقف تھا اور وہ اپنی ضرورت کے لیے دوائیں اس کی دکان سے لیا کرتے تھے۔ انہوں نے جیپ اس کی دکان کے آگے روک لی۔ محمود، فاروق اور فرزانہ کو جیپ میں ہی ٹھہرنے کا اشارہ کیا اور پھر خود دکان میں داخل ہو گئے۔ انہوں نے دیکھا جاتے ہوئے وہ جاوا اینڈ کو کی دواؤں کی فہرست ساتھ لے گئے تھے۔

دکان کے مالک نے ان کا گرم جوشی سے استقبال کیا اور بولے:

''آپ نے کیوں زحمت کی۔ اگر کوئی ضرورت تھی تو مجھے بلا لیا ہوتا۔''

''کوئی بات نہیں بھئی، ادھر سے گزر رہا تھا، لہٰذا خود ہی آ گیا۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ جاوا اینڈ کو کی دوائیں بھی فروخت کرتے ہیں آپ؟''

''جی ہاں، کیوں کیا بات ہے؟''

''اس کمپنی کی دوائیں کیسی جا رہی ہیں۔ میرا مطلب ہے، بازار میں ان کی مانگ کا کیا حال ہے؟''

''بہت ہی اچھا حال ہے، بلکہ دوسری کمپنیوں کے مقابلے میں یہ زیادہ کامیاب ہے۔''

''ہوں، اور شیخ برادرز کی دواؤں کا کیا حال ہے؟'' انہوں نے پوچھا۔

''بہت پتلا حال ہے۔ ان کی دوائیں ناکام ہو رہی ہیں۔'' اس نے کہا۔

''کیا پہلے کامیاب تھیں یا شروع سے ہی ناکامی ان کا مقدر بنی ہوئی ہے۔''

''شروع میں تو ان کی بہت مانگ تھی، لیکن اب نہیں۔ شاید انہوں نے ایمانداری سے دواؤں کے اجزا شامل کرنا چھوڑ دیے ہیں۔''

''ہوں، ضرور یہی بات ہے۔'' انہوں نے کہا اور پھر اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے باہر نکل آئے۔

ان کے ذہن میں اب ایک کھچڑی سی پکنے لگی تھی۔ جب وہ جیپ کے پاس آئے تو کھچڑی میں زور شور سے کھدبد ہونے لگی لیکن محمود، فاروق اور فرزانہ اس کھدبد سے بالکل بے خبر تھے۔ وہ تو اپنی امی کے خیال میں گم تھے۔

☆☆☆

ایک فیصلہ

وہ دفتر پہنچے تو اکرام پر نظر پڑی۔ اس کی صورت پر اڑھائی بج رہے تھے۔

''معلوم ہوتا ہے، مسلسل ناکامی کا منہ دیکھتے رہے ہو۔'' انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

''جی، جی ہاں۔ ہم پورا زور لگانے کے بعد بھی بیگم صاحبہ کے بارے میں کچھ معلوم نہیں کر سکے۔ کوئی سراغ نہیں لگا سکے۔''

''کوئی بات نہیں، خود ہمارا بھی یہی حال ہے۔ میں نے جن لوگوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی ہدایت کی تھی، ان کے بارے میں کیا رہا؟''

''تحریری رپورٹیں موصول ہو گئی ہیں، ملاحظہ فرمالیں۔'' اکرام نے میز کی دراز میں سے چند کاغذ نکال کر ان کے سامنے رکھ دیے۔

''بیٹھو بھئی، تھک گئے ہو گے۔'' انسپکٹر جمشید نے تینوں سے کہا۔ اور خود بھی بیٹھ گئے۔

انہوں نے ان کاغذات کا مطالعہ شروع کر دیا۔ کمرے میں گہری خاموشی طاری ہو گئی۔ آخر انہوں نے کاغذ ان کے سامنے پھینکتے ہوئے کہا۔

''کوئی کام کی بات معلوم نہیں ہو سکی۔''

محمود، فاروق اور فرزانہ نے بھی ان کاغذات کا مطالعہ کیا۔ ان کاغذات میں شیخ برادرز کے مالک ڈاکٹر شریف شیخ، اکاؤنٹنٹ حامد غوری، جاوا اینڈ کو کے منیجر اور عباس

شاہین کے بارے میں حاصل کی گئیں معلومات درج تھیں۔ انہیں بھی ان میں کوئی خاص بات نظر نہیں آئی۔

''اب آپ کیا کریں گے۔'' اکرام نے فکر مندانہ لہجے میں کہا۔

''بیگم کو تلاش کروں گا اور کیا کروں گا۔'' وہ غمگین انداز میں مسکرائے۔

''لیکن کہاں تلاش کریں گے، کس طرح تلاش کریں گے۔'' وہ بولا۔

''کچھ کہہ نہیں سکتا۔ ان رپورٹوں سے حامد غوری اور عباس شاہین کا بھی کوئی تعلق معلوم نہیں ہو سکا۔ بس اتنا ضرور معلوم ہوا ہے کہ وہ دونوں اکثر ہوٹل ذی شان میں اکٹھے کھانا کھاتے ہیں۔''

''معاف کیجئے گا جناب۔ میرا خیال ہے، ہمیں بیگم صاحبہ کو کھائی اور سڑک کے آس پاس ہی تلاش کرنا چاہئے۔ ہم ضرور غلط سمت میں تلاش کرتے رہے ہیں۔''

''لیکن اس جگہ کا تو ہم ایک ایک چپہ دیکھ چکے ہیں اور تمہارے آدمی بھی جائزہ لے چکے ہوں گے۔ پھر یہ تو سوچو، اگر بیگم وہیں کہیں گری تھیں تو کسی نے تو انہیں دیکھا ہوگا، پھر اس نے پولیس میں اطلاع کیوں نہیں دی۔ لوگوں میں اس بات کا چرچا کیوں نہیں ہوا۔ نہیں اکرام، بیگم وہاں نہیں گری تھیں۔ اگر وہاں گری ہوتیں تو اس وقت تک ان کے بارے میں ضرور کوئی اطلاع مل چکی ہوتی۔''

''پھر آپ ہی بتائیے، آخر وہ کہاں ہیں؟''

''ہم یہی معلوم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میں نے جتنے لوگوں کی نگرانی کی ہدایات دے رکھی ہیں، ان کی نگرانی تو بدستور جاری ہے نا۔''

''جی ہاں، اس میں بالکل کوتاہی نہیں ہو رہی۔''

''بس ٹھیک ہے، اب ہمیں رات ہونے تک صبر کر کے بیٹھ رہنا ہے۔ اس کے سوا ہم اور کچھ نہیں کر سکتے۔''

''اور رات ہونے پر آپ کیا کریں گے؟''

''اس کیس میں مجھے ابھی تک جتنے بھی آدمی ملے ہیں، ان سب پر شبہ کر رہا ہوں، لیکن ساتھ ہی میں یہ بھی محسوس کر رہا ہوں کہ ان میں سے کسی پر بھی شبہ کرنے کی میرے پاس کوئی وجہ نہیں ہے۔ ان حالات میں میں حیران ہوں کہ کیا کروں۔ کوئی راستہ نظر نہیں آتا: بہر حال میں نے ایک فیصلہ کیا ہے اور میں سوچ رہا ہوں۔ ہمیں اس پر عمل کر کے دیکھ ہی لینا چاہیے۔''

''اور آپ کا فیصلہ کیا ہے؟''

''جاوا اینڈ کو کی رات کے وقت تلاشی لی جائے، نہایت خاموشی سے اس وقت وہاں کوئی نہیں ہوگا اور ہم نہایت اطمینان سے ایک ایک چیز کو دیکھ سکیں گے۔''

''کیا انکل اکرام بھی ہمارے ساتھ چلیں گے۔'' محمود نے پوچھا۔

''نہیں، تمہارے انکل ہماری واپسی کا انتظار کریں گے اور انتظار بھی دفتر میں بیٹھ کر کریں گے۔ اگر ہم رات کے دو بجے تک بھی واپس نہ آئے تو اکرام کو حرکت میں آ جانا چاہیے۔''

''بہت بہتر، میں سمجھ گیا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔'' اکرام نے کہا۔

''ابا جان، ہم نے صبح سے گھر کا چکر نہیں لگایا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ امی جان گھر پہنچ چکی ہوں۔'' فرزانہ نے نئی کہی۔

''کیا بات کرتی ہو، اگر وہ گھر پہنچی ہوتیں تو سب سے پہلے انہوں نے دفتر فون کر کے انکل اکرام کو یہ خبر سنائی ہوتی۔'' محمود نے کہا۔

''محمود کا خیال ٹھیک ہے، پھر بھی تم فون کر کے دیکھ سکتی ہو۔''

فرزانہ نے گھر کے نمبر ڈائل کیے، لیکن کسی نے ریسیور نہ اٹھایا۔ پھر اس نے بیگم شیرازی کے نمبر ڈائل کیے۔ انہوں نے فوراً جواب دیا۔ لیکن انہوں نے یہی اطلاع دی

کہ ان کی امی گھر نہیں پہنچیں۔

''چھوڑو، ہمیں یہی کرنا ہوگا جو میں کہہ چکا ہوں۔'' انسپکٹر جمشید نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔

☆☆

رات کے ٹھیک ساڑھے بارہ بجے چاروں جاوا اینڈ کو سے کچھ فاصلے پر پہنچ کر جیپ سے اتر گئے۔ انسپکٹر جمشید نے جیپ کو سڑک سے اتار کر کھڑا کیا تھا۔ دن میں وہ جاوا اینڈ کو کا چاروں طرف سے جائزہ لے چکے تھے۔ بظاہر اندر داخل ہونے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ لیکن انسپکٹر جمشید نے نائیلون کی رسی کی سیڑھی اس بیگ سے نکالی جو وہ ساتھ لائے تھے۔ سیڑھی کے ایک سرے میں لوہے کا آنکڑہ بندھا ہوا تھا۔ انہوں نے آنکڑا اوپر اچھالا جو خاردار تاروں میں پھنس گیا۔ انہوں نے اسے کھینچ کر اندازہ لگایا کہ اچھی طرح پھنس گیا ہے یا نہیں۔ اب انہوں نے بیگ میں سے ربڑ کی ایک موٹی چادر نکال کر ہاتھ میں لے لی اور بیگ سے رسی کی ایک اور سیڑھی نکالی۔ اس کے بعد وہ سیڑھی پر چڑھتے چلے گئے۔

رات تاریک تھی۔ اور اس بات کا خطرہ نہیں تھا کہ انہیں چڑھتے ہوئے دیکھ لیا جائے گا۔ خاردار تاروں کے نزدیک پہنچ کر انہوں نے ربڑ کی چادر تاروں کے اوپر ڈال دی اور دوسری سیڑھی اندر کی طرف لٹکا کر اس کا آنکڑا تاروں میں الجھا دیا۔ پھر ربڑ کی چادر پر ہاتھ رکھ کر دوسری طرف ہو گئے اور باڑ کے اوپر سے نیچے جھانک کر انہیں بھی اوپر آنے کا اشارہ کیا۔ ان کے بعد فرزانہ سیڑھی پر چڑھنے لگی۔ ادھر وہ دوسری طرف اترنے لگے۔ جب وہ نیچے پہنچے تو فرزانہ باڑ تک پہنچ چکی تھی اور جب فرزانہ ان کے پاس پہنچی تو محمود انہیں اوپر کھڑا ایک سائے کی مانند نظر آیا سب سے آخر میں فاروق چڑھا۔ دن میں وہ پوری عمارت کے کمروں کو دیکھ چکے تھے: لہذا انسپکٹر جمشید نے

سرگوشی میں کہا۔

''ہم سب سے پہلے نچلی منزل کا جائزہ لیں گے۔''

وہ اس پھاٹک پر پہنچے، جو نچلی منزل کے باہر لگایا گیا تھا۔ انہوں نے دیکھا، پھاٹک بند تھا۔ انسپکٹر جمشید نے جیب سے چابیوں کا گچھا نکالا۔ یہ پھاٹک لوہے کی چپٹی اور موٹی پتریوں سے بنایا گیا تھا۔ انہوں نے ایک ایک کر کے چابیاں لگانا شروع کیں۔ آخر ایک چابی سے تالا کھل گیا۔ چاروں اندر داخل ہوئے اور ڈھلوان راستے پر چلتے ہوئے اس میدان تک پہنچے جس میں انہوں نے ٹرک کھڑے دیکھا تھا۔ ٹرک اب بھی وہیں کھڑا تھا۔ انہوں نے اس کے ایک ایک انچ کا ایک بار پھر جائزہ لیا۔ اس کام کے لیے وہ طاقتور ٹارچیں ساتھ لائے تھے اور پھر انسپکٹر جمشید نے جھک کر چٹکی سے کوئی بہت ہی باریک چیز اٹھائی۔ انہوں نے دیکھا، ان کی چٹکی میں ایک بہت لمبا سیاہ رنگ کا بال تھا۔

اس بال کو دیکھتے ہی ان کے دل ایک دھڑکنا بھول گئے۔ یہ پہلا مکمل سراغ ملا تھا، اس بات کا کہ بیگم جمشید اس ٹرک پر ہی گری تھیں۔ ان کی امیدوں کے چراغ جگمگا اٹھے۔ چہروں پر تازگی دوڑ گئی۔

''مار لیا میدان۔'' فرزانہ نے خوش ہو کر کہا۔

''خاموش، بول کر ہم کوئی خطرہ بھی مول لے سکتے ہیں۔''

''لیکن ابا جان، بھلا رات کے وقت یہاں کون ہوگا۔''

''یہ نہ کہو، اگر تمہاری امی ان لوگوں کی قید میں ہیں تو یہ بھی بے خبر نہیں ہوں گے۔ پوری طرح چوکنے ہوں گے، کیونکہ یہ لوگ اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں ان پر شک کر رہا ہوں۔''

''اوہ'' فرزانہ کے منہ سے نکلا اور پھر اس نے اپنے ہونٹ مضبوطی سے بند کر

لیے۔

''آؤ۔'' انسپکٹر جمشید نے دبے لہجے میں کہا۔

''ٹرک سے اتر کر وہ کمروں کی طرف آئے۔ انسپکٹر جمشید کا رخ پیٹیوں والے کمروں کی طرف تھا۔ انہوں نے تمام پیٹیاں ہٹا ہٹا کر دیکھا، پھر کسی خیال کے تحت انہوں نے ایک پیٹی کو کھول ڈالا۔ اس میں کسی دوسری کمپنی کی دوا کی شیشیاں بھری ہوئی تھیں۔ انہوں نے ایک شیشی کا ڈھکنا کھول ڈالا اور ایک گولی نکال کر اسے چکھا، پھر دوسری پیٹی کھولی۔ اس میں ایک اور کمپنی کی دوا تھی۔ انہوں نے اس دوا کو بھی چکھا اور پھر سیدھے ہوتے ہوئے بولے۔

''بیگم اس عمارت میں قید ہیں۔''

محمود، فاروق اور فرزانہ اس جملے کو سن کر حیران ہوئے بغیر نہ رہے۔ انہوں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا اور پھر ان کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھیل گئیں۔ اس وقت انسپکٹر جمشید دروازے کی طرف کمر کیے کھڑے تھے۔ جب کہ ان کے منہ دروازے کی طرف تھے انہوں نے دیکھا، دروازہ جو ابھی چند سیکنڈ پہلے کھلا ہوا تھا، اب بند ہو چکا تھا۔ اور اس کے تالے کے سوراخ میں سے سفید رنگ کا دھواں اندر آ رہا تھا۔

ان کی آنکھوں میں خوف دیکھ کر انسپکٹر جمشید بجلی کی سی سرعت سے پلٹے اور پھر ان کا سر زور سے چکرایا۔ انہوں نے اپنا سانس روک کر خود کو سفید رنگ کے اندر آنے والے دھوئیں سے بچانے کی زبردست کوشش کی۔ لیکن دھواں ہر آن گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ پھیلتا جا رہا تھا۔ انہوں نے بے ہوش ہونے سے پہلے یہ بھی دیکھا کہ محمود، فاروق اور فرزانہ کمرے کے فرش پر بے سدھ پڑے تھے۔

☆☆☆

دھوئیں کے بعد

سب سے پہلے انسپکٹر جمشید کو ہوش آیا۔ انہوں نے دیکھا محمود فاروق اور فرزانہ ان کے دائیں بائیں ابھی تک بے ہوش پڑے تھے۔ انہوں نے ادھر ادھر دیکھا۔ نظریں دوڑائیں۔ یہ وہ کمرہ نہیں تھا، جس میں انہوں نے پٹیاں کھول کر دیکھا تھا۔ یہاں تو سرے سے پٹیاں تھیں ہی نہیں۔ انہوں نے اٹھ کر ان تینوں کو جھنجھوڑا، تب کہیں جا کر انہیں ہوش آیا۔ انہوں نے بھی حیرت زدہ انداز میں پلکیں جھپکائیں۔

''ہم شاید کہیں اور پہنچا دیے گئے ہیں۔'' محمود بولا۔

''ہاں، تمہارا خیال صحیح ہے اور میرا یہ خیال کہ تمہاری امی زندہ ہیں اور اس کمپنی کی عمارت میں ہیں، بالکل درست ہے۔''

''لیکن یہ چکر کیا ہے۔ جاوا اینڈ کو والوں کو ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔''

''گویا تم ابھی تک نہیں سمجھے۔'' وہ بولے۔

''تو کیا چکر آپ کی سمجھ میں آ چکا ہے؟''

''اگر نہ آیا ہوتا تو ہمیں کبھی بھی اس دھوئیں کے ذریعے بے ہوش نہ کیا جاتا۔ ہاں، یہ اس صورت میں ضرور کیا جا سکتا تھا، جب تمہاری امی ہمیں کہیں نظر آ جاتیں۔ ان دونوں صورتوں کے علاوہ وہ ہرگز ہمیں چھیڑنے کی کوشش نہ کرتے۔''

''لیکن امی جان کہاں ہیں، وہ ابھی تک ہمیں نظر کیوں نہیں آئیں۔''

''وہ بھی جلد نظر آ جائیں گی۔ فکر نہ کرو۔''

''خیر، آپ چکر بتانے جا رہے تھے۔''

''ہاں ضرور۔ مجھے تمہاری الجھن دور کر ہی دینی چاہیے۔''

ابھی وہ اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ کمرے کا دروازہ کھلا اور عباس شاہین کی صورت دکھائی دی۔ ساتھ ہی اس کی آواز کانوں سے ٹکرائی۔

''ہم نے کتنی کوشش کی تھی کہ تم ہم پر شک نہ کر سکو، مگر تم نے بھی پتا نہیں کس قسم کا دماغ پایا ہے۔ کاش تمہاری بیوی ہمارے ٹرک پر نہ گری ہوتی۔''

''تو امی یہیں ہیں؟'' فرزانہ نے بے تابی کے عالم میں کہا۔

''ہاں، اب تمہاری امی کو تم سے الگ رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ تم بھی اس کشتی پر سوار ہو چکے ہو، جس میں وہ تم سے پہلے سوار ہو چکی ہیں۔ اگر وہ میری اور جانباز کی باتیں نہ سن لیتیں تو میں انہیں کب کا تمہارے پاس پہنچا چکا ہوتا اور شکریہ بھی وصول کر چکا ہوتا۔ بُرا ہو اس گھڑی کا، جب میں جانباز سے باتیں کرنے لگ گیا اور پھر میری نظر کانٹوں کے درمیان سکڑی سمٹی اس عورت پر پڑی۔ میں چونک کر خاموش ہو گیا۔ پھر ان سے پوچھا کہ وہ کون ہیں اور یہاں کس طرح آئیں۔ انہوں نے بتایا کہ وہ پہاڑ سے لڑھک کر ٹرک پر آ گری تھیں اور بے ہوش ہو گئی تھیں۔ انہیں ابھی ابھی ہوش آیا ہے، پھر انہوں نے اپنے بارے میں بتایا اور درخواست کی کہ انہیں ان کے گھر پہنچا دیا جائے۔ جب میں نے یہ سنا کہ یہ انسپکٹر جمشید کی بیگم ہیں تو میرے کان کھڑے ہوئے اور میں نے ان سے پوچھا کہ کیا وہ یہاں ہونے والی گفتگو سن چکی ہیں۔ انہوں نے فوراً کہہ دیا کہ ہاں...... سن چکی ہوں؛ گویا جھوٹ بولنے کی بالکل کوشش نہیں کی۔ میں ان کی جرأت پر حیران ہو گیا۔ لیکن مجبور تھا۔ اب انہیں ان کے گھر نہیں پہنچا سکتا تھا۔ یہ ہمارے ایک راز سے باخبر ہو چکی تھیں اور جو عورت اتنی جرأت مند ہو کہ دشمنوں کی قید

میں بھی یہ کہنے سے نہ چوکے کہ وہ سب کچھ سن چکی ہیں۔ اس سے یہ کس طرح امید کی جا سکتی ہے کہ وہ گھر جانے کے بعد اپنے انسپکٹر خاوند کو ہمارے بارے میں نہیں بتائے گی؛ چنانچہ مجھے انہیں یہاں رکھنا پڑا۔ اوپر والی تین منزلوں کے علاوہ یہاں چوتھی منزل بھی ہے اور یہ سب سے نیچے ہے۔ اس کے بارے میں صرف کمپنی میں کام کرنے والوں کو معلوم ہے۔ ہم اپنا اصل کام یہیں کرتے ہیں۔ جب آپ تفتیش کے لیے یہاں آئے، تو ہم ٹھٹکے، ہمیں ہرگز یہ امید نہیں تھی کہ آپ اس قدر جلد یہاں آجائیں گے؛ تاہم ہم انتظام پہلے ہی کر چکے تھے کہ آپ کو ہم پر شک نہ ہو سکے اور یہی ہوا۔ آپ نے اگرچہ شروع میں ہم پر شک ضرور کیا تھا، لیکن بعد میں شک دور ہو گیا، لہٰذا ہم نے سوچا کہ آپ اب یہاں نہیں آئیں گے، لیکن پھر آپ دوبارہ سوال کرنے کے لیے آگئے تو ہم چونکے اور جان گئے کہ آپ ہمیں اب باقاعدہ شک کی نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ کیونکہ آپ نے میری آمدنی اور کوٹھی کے خرچ کے بارے میں بھی سوالات کیے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ آپ میری آمدنی کے بارے میں اندازہ لگانا چاہتے ہیں۔ ادھر ہمیں ہدایات یہ دی گئی تھیں کہ اپنے بارے میں آپ کے سوالات کے جوابات کسی طرح بھی غلط نہ دیے جائیں۔ جوابات ہر لحاظ سے درست ہونے چاہئیں، تاکہ اگر آپ تصدیق کریں تو ہم جھوٹے ثابت نہ ہوں۔ ہماری اس قدر زبردست احتیاط کے باوجود آپ یہاں نظر آ رہے ہیں اور اسے ہم اچھا نہیں سمجھتے۔ نہ اپنے حق میں نہ آپ کے حق میں۔ کاش، ایسا نہ ہوا ہوتا۔" یہاں تک کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔

"پہلے تو ان بچوں کا ان کی ماں سے ملا دینا چاہیے۔ یہ باتیں تو ہم بعد میں بھی کر لیں گے۔"

"ہاں، یہ ٹھیک ہے۔ جانباز خان، بیگم جمشید کو یہاں لے آؤ۔" اس نے اونچی آواز میں کہا۔ چند لمحے کے لیے خاموشی طاری رہی۔ پھر دروازہ کھلا اور انہوں نے

بیگم جمشید کو تھکے تھکے انداز میں آتے دیکھا۔

"امی جان۔" وہ ایک ساتھ پوری قوت سے چلائے اور پھر ان کی طرف دوڑ پڑے۔ وہ ان سے لپٹ گئے اور رونے لگے۔ انسپکٹر جمشید نے اپنے بچوں کو کبھی اس طرح روتے نہیں دیکھا تھا۔ یہ ان کی زندگی میں شاید پہلا موقع تھا۔ ان کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے۔

"ان لوگوں نے کوئی تکلیف تو نہیں دی۔"

"نہیں، بس کمرے میں بند کر رکھا تھا۔" انہوں نے کہا۔

"ان لوگوں سے سچ بولنے کی کیا ضرورت تھی۔ کہہ دیا ہوتا کہ ان کی گفتگو نہیں سنی۔" انہوں نے اداس انداز میں کہا۔

"آپ کی صحبت میں رہ کر جھوٹ بولنے کے بارے میں کبھی سوچا بھی نہیں۔" وہ بولیں۔

"لیکن جس جھوٹ سے بھلائی کا کوئی پہلو نکلتا ہو، اس کے بولنے میں کوئی حرج نہیں ہوتا۔ اب دیکھو نا تمہارے ساتھ ہم بھی یہاں پھنس گئے ہیں۔" انہوں نے کہا۔

"میں نے یہ نہیں سوچا تھا۔" وہ بولیں۔

"خیر کوئی بات نہیں، جو ہونا تھا ہو گیا۔" یہ کہہ کر وہ عباس شاہین کی طرف مڑے۔ اب اس کے ہاتھ میں سیاہ رنگ کا پستول نظر آیا۔ اس کے ساتھ کھڑے جانباز کے ہاتھ میں بھی پستول تھا۔ ان کی نالیوں کا رخ ان کی طرف تھا۔

"اب تمہارا کیا پروگرام ہے مسٹر عباس شاہین۔" انہوں نے پوچھا۔

"ہم نے آج تک کبھی انسانی خون سے ہاتھ نہیں رنگے، لیکن اب مجبور ہو گئے ہیں۔ اگر یہ نہ کیا تو ہم سب کا بیڑا غرق ہو جائے گا۔"

"گویا تم ہمیں موت کے گھاٹ اتارنے کا فیصلہ کر چکے ہو؟"

''فیصلہ ہونا تو ابھی باقی ہے۔ ڈاکٹر صاحب خود یہاں آنے والے ہیں، کیونکہ میں نے انہیں واقعات کی تفصیل سنا دی تھی اور کہہ دیا تھا کہ خود آ کر حالات کا جائزہ لے لیں۔ وہ آنے ہی والے ہیں۔ یہ فیصلہ وہی کریں گے کہ کیا کرنا ہے۔''

''بہت اچھا۔ دیکھا جائے گا۔'' انسپکٹر جمشید نے لا پروائی سے کندھے اچکائے۔

''ابا جان، اب تک ہماری سمجھ میں پوری بات نہیں آئی۔ مہربانی فرما کر ہماری الجھن بھی رفع کر دیجیے۔''

''ہاں ضرور، اب کرنے کے لیے کوئی کام بھی تو نہیں ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ جب تمہاری امی اس کمپنی کے ٹرک پر گر کر یہاں تک پہنچ گئیں اور انہوں نے جانباز اور عباس شاہین کے درمیان ہونے والی گفتگو سن لی۔ تو عباس شاہین نے انہیں دیکھ لیا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ یہ بے ہوش بن جاتیں اور ان لوگوں کے ہوش میں لانے کے بعد آنکھیں کھولتیں، پھر انہیں بتاتیں کہ ان کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ چنانچہ یہ لوگ انہیں ضرور گھر تک پہنچا دیتے اور پھر وہ ان دونوں کی گفتگو مجھے سنا دیتیں، لیکن ہوا یہ کہ بیگم نے بے ہوش بن کر دکھانے کی بجائے یہ اقرار کر لیا کہ انہوں نے گفت گو سن لی ہے اور یہ بھی بتایا کہ وہ کون ہیں۔ عباس شاہین گھبرا گیا۔ اس نے فوراً صورت حال منیجر کو بتائی۔ منیجر نے اس کمپنی کے مالک سے رابطہ قائم کیا۔''

''ایک منٹ ابا جان۔'' محمود نے جلدی سے کہا، پھر بولا: ''آپ نے کیا فرمایا، کمپنی کے مالک سے رابطہ قائم کیا، لیکن ان لوگوں کا تو کہنا ہے کہ کمپنی کے مالک ملک سے باہر گئے ہوئے ہیں۔''

''ہاں، یہ انہوں نے جھوٹ کہا تھا۔ کمپنی کے مالک یہیں ہیں۔ اور بہت جلد ان سے ہماری ملاقات ہونے والی ہے۔ ہاں تو کمپنی کے مالک نے فوری طور پر ایک

میٹنگ بلائی۔ مشورہ کیا کہ کیا کیا جائے۔ آخر انہوں نے طے کر لیا کہ وہ بیگم کو یہیں ایک کمرے میں بند کریں گے۔ انہیں گھر نہیں پہنچائیں گے۔ چنانچہ انہیں بند کر دیا گیا اور اس غرض کے لیے انہوں نے سب سے نچلی منزل کا کمرہ استعمال کیا۔ یہ منزل خفیہ طور پر بنائی گئی ہے۔ اس کا عام لوگوں کو پتا نہیں صرف یہاں کام کرنے والوں کو پتا ہے۔ دراصل ان لوگوں کا کاروبار بہت ہی گھناؤنا ہے۔ بہت خوف ناک ہے۔ یہ لوگ انسانیت کے قاتل ہیں۔''

''جی! انسانیت کے قاتل؟'' فرزانہ کے منہ سے حیرت زدہ انداز میں نکلا۔

''ہاں، یہ دوسری کمپنیوں کی دواؤں کے آرڈر بھی وصول کرتے ہیں اور دوائیں خرید کر بازار میں پہنچاتے ہیں، لیکن یہ بہت کم دوائیں خریدتے ہیں۔ انہوں نے تمام کمپنیوں کے لیبل، ڈبیاں اور شیشیاں وغیرہ تیار کرا کر رکھی ہیں۔ یہ ان میں جعلی دوائیں بھر بھر کر ہٹیوں میں بند کر دیتے ہیں۔ یہاں بننے والی جعلی دواؤں کے لیے ہٹیوں کی ضرورت بھی پڑتی ہے اور روئی کی بھی۔ شیشوں میں گولیوں کو نمی سے بچانے کے لیے روئی بھی ڈالی جاتی ہے۔ یہ روئی سے یہی کام لیتے ہیں۔ ان گانٹھوں میں صاف شدہ روئی ہے۔ یہ روئی ہٹیوں میں لگانے کے کام نہیں آئے گی۔ اس غرض کے لیے تو کاغذ وغیرہ استعمال کیے جاتے ہیں۔ دوسری طرف یہ اپنی کمپنی کی دوائیں بھی تیار کرتے ہیں۔ ان میں کوئی غلط چیز شامل نہیں کرتے۔ یہ دوائیں اصل ہوتی ہیں، لہٰذا یہ دوائیں تو روز بروز مشہور ہو رہی ہیں اور دوسری کمپنیوں کی دوائیں ناکام ہو رہی ہیں۔ ناکام کیوں نہ ہوں۔ یہ کمپنی پورے ملک کی دکانوں پر دوائیں پہنچا رہی ہے اور ان میں ۷۵ فیصد سے زائد دوائیں جعلی ہوتی ہیں۔ جہاں جعلی دواؤں کی بھرمار ہو، وہاں خالص دوائیں ایک دم کامیاب ہو جاتی ہیں؛ چنانچہ ان کی اپنی کمپنی کی دوائیں بہت فروخت ہو رہی ہیں۔ دوسری طرف جعلی دواؤں سے یہ لاکھوں روپے

روزانہ کمارہے ہیں۔ ان میں چونا، نمک اور پلاسٹر آف پیرس جیسی چیزوں کے سوا ہوتا کیا ہے اور بکتی ہیں یہ اسی ریٹ پر جو دوسری کمپنیوں نے اپنی دواؤں کے مقرر کر رکھے ہیں، گویا یہ ملک اور قوم کو دونوں ہاتھوں سے لوٹنے کے ساتھ ساتھ ان کی صحت سے بھی کھیل رہے ہیں۔ بیمار دوائیں استعمال کرتے ہیں۔ پیسے خرچ کرتے ہیں، لیکن انہیں فائدہ نہیں ہوتا۔ فائدہ ہو کیسے؟ وہ تو صرف چونا کھا رہے ہیں، یا پھر سفید نمک وغیرہ۔ ان چیزوں کے زیادہ استعمال سے انہیں اور نقصان تو ہو سکتا ہے، فائدہ نہیں۔ میں نے جب تک ان کی جعلی دواؤں کو چیک نہیں لیا، یہ لوگ سامنے نہیں آئے۔ اگر میں معاملے کو بھانپ نہ لیتا تو یہ سامنے آتے بھی نہ اور ہم یہاں سے مایوس ہو کر نکل جاتے۔ ہمارا شک اس کمپنی پر سے ختم ہو جاتا، ساتھ ہی ہم تمہاری امی کو کبھی تلاش نہ کر پاتے۔ ہم ان کی تلاش میں ساری زندگی مارے مارے پھرتے۔ لوگ کہتے، یہ وہ انسپکٹر جمشید اور اس کے بچے ہیں، جنہوں نے ہزاروں کیس تو حل کر دیے، لیکن اپنا ایک کیس آج تک حل نہیں کر سکے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم وہ دن دیکھنے سے بچ گئے۔ اب زندگی رہے یا جائے۔ لوگ ہمیں طعنہ نہیں دے سکیں گے۔" یہ کہتے ہوئے انہوں نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ ابھی صرف ڈیڑھ بجا تھا؛ گویا اکرام کے حرکت میں آنے میں ابھی آدھ گھنٹا باقی تھا، انہیں کسی نہ کسی طرح آدھ گھنٹا گزارنا تھا۔ ابھی تو ان لوگوں کے ڈاکٹر صاحب بھی نہیں آئے تھے۔ ان کے آنے کے بعد ہی کوئی فیصلہ ہو سکتا تھا، لہٰذا انسپکٹر جمشید نے پھر کہنا شروع کیا:

"اب تم حیران ہو رہے ہو گے کہ میں نے یہ سب اندازے کس طرح لگائے۔ جاوا اینڈ کو پر مجھے شک کیوں ہوا۔ عباس شاہین پر شک کس طرح ہوا، تو اس کا جواب بہت ہی سادہ اور آسان ہے۔ تمہیں یاد ہو گا۔ جیپ میں بیٹھ کر میں نے ایک حساب لگایا تھا، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ حساب کا ایک سوال نکالا تھا۔ حساب کا وہ سوال حل

کرتے ہی میں ایک دم سب کچھ سمجھ گیا تھا۔ شیخ برادرز کے اکاؤنٹنٹ حامد غوری نے ٹرک کی فروخت کی تاریخ ۱۱ جولائی بتائی تھی۔ دستخط بھی گیارہ جولائی کے کیے گئے تھے۔ میں نے عباس شاہین کے دستخط اس لیے دیکھے تھے کہ ان کے نیچے تاریخ بھی دیکھ لوں۔ میں نے تقویم کے طریقے سے گیارہ جولائی کا دن نکالا اور یہ ایک حیرت انگیز اتفاق تھا کہ وہ دن جمعے کا نکلا۔ اور مجھے معلوم ہو گیا کہ شیخ برادرز والے اور عباس شاہین جھوٹ بول رہے ہیں دراصل انہوں نے آپس میں کوئی ٹرک ورک فروخت نہیں کیا تھا۔ یہ سب کاغذی کارروائی تھی جو بیگم کے ان کی گفتگو کو سن لینے اور میٹنگ میں مشورہ کرنے کے بعد عمل میں لائی گئی تھی۔ انہوں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ میں ٹرک کا سراغ ضرور لگا لوں گا اور سیدھا شیخ برادرز کے ہاں پہنچوں گا، کیونکہ ٹرک ان کی ملکیت تھا۔ لہٰذا انہوں نے سوچا، ٹرک کی فروخت کا ڈرامہ کھیلا جائے، لیکن اس سلسلے میں ان کے منہ سے ایک سچ بھی نکل گیا اور وہ یہ کہ حامد غوری کی مسٹر عباس شاہین سے ملاقات ہوٹل ذی شان میں ہوئی تھی؛ چنانچہ ہم بھی کھانا کھانے کی نیت سے ہوٹل ذی شان پہنچ گئے، اس سے پہلے ہم شیخ برادرس کے رجسٹر میں درج شدہ عباس شاہین کے پتے پر بھی جا چکے تھے، لیکن وہاں ہماری ملاقات ایک شخص شیروانی سے ہوئی تھی۔ دراصل عباس شاہین نے جان بوجھ کر ۱۳۔ اے کی بجائے صرف ۱۳ نمبر لکھوایا تھا، تا کہ اول تو ہم چکرا جائیں اور اگر کسی طرح ہم اس تک پہنچ بھی جائیں تو وہ کہہ سکے کہ اے بھول میں نہیں لکھا گیا۔ ہوا بھی یہی...... ہوٹل میں ہمیں عباس شاہین کھانا کھاتے نظر آ گئے اور ہم اس کا تعاقب کرتے ہوئے جاوا اینڈ کو تک پہنچ گئے۔ پھر یہاں تفتیش شروع ہوئی۔ عباس شاہین سے ملاقات ہوئی۔ ٹرک بھی دیکھا اور روئی کی گانٹھیں بھی۔ لیکن کوئی سراغ نہ مل سکا۔ ہم نے جا کر ۱۳۔ اے کا جائزہ لیا۔ یہ ایک عظیم الشان کوٹھی تھی اور پانچ ہزار کیا دس ہزار روپے تنخواہ لینے والا بھی اس قسم کی کوٹھی نہیں بنا سکتا

تھا؛ چنانچہ ہم نے پھر آ کر عباس شاہین سے سوالات کیے۔ ادھر میں نے تقویم کا سوال نکال کر ان کا جھوٹ پکڑ لیا اور میرا شک پختہ ہوتا چلا گیا کہ کوئی چکر ضرور ہے۔ پھر میں نے دواؤں کی کھپت کے بارے میں معلوم کیا۔ پتا چلا دوسری کمپنیوں کے مقابلے جادا اینڈ کو کی دوائیں تیزی سے مقبول ہو رہی ہیں۔ اس سے میرے شک کو اور بھی تقویت ملی۔ آخر میں نے رات کے وقت یہاں آ کر تلاشی لینے کا پروگرام بنا لیا۔ پھر جونہی میں نے ان دواؤں کو چکھا۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ یہ فرم کیا کام کر رہی ہے۔ اسی وقت ہم پر وہ دھواں چھوڑ دیا گیا۔''

یہاں تک کہہ کر انسپکٹر جمشید خاموش ہو گئے۔ عباس شاہین اور جانباز خاں نہایت پر سکون انداز میں ان کی تقریر سنتے رہے تھے۔ ان کے خاموش ہونے پر عباس شاہین نے کہا۔

''شکر کرو انسپکٹر، ابھی ہم نے اس دھوئیں کی معمولی سی مقدار اندر چھوڑی تھی؛ ورنہ اس وقت تم لوگوں کی لاشیں یہاں پڑی ہوتیں۔ یہ دھواں بھی ہمارے ڈاکٹر صاحب کی حیرت انگیز ایجاد ہے۔''

اسی وقت ایک تیز گھنٹی کی آواز نے انہیں جھنجھوڑ ڈالا۔ عباس شاہین اور جان باز خان چونک اٹھے۔ پھر ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا:

''ڈاکٹر صاحب آ گئے۔''

اس کے ساتھ ہی قدموں کی آواز گونجی۔ کمرے کا دروازہ زوردار آواز کے ساتھ کھلا اور ڈاکٹر شریف شیخ آنکھوں پر بڑے بڑے شیشوں کی عینک لگائے اندر داخل ہوا۔ اس کے دائیں بائیں دو باڈی گارڈ پستول لیے چل رہے تھے۔

☆☆☆

پھر دھواں

''خوش آمدید ڈاکٹر، ہمیں آپ کا ہی انتظار تھا۔'' انسپکٹر جمشید خوش ہو کر بولے۔

''میری عادت ہے، میں کسی کو مایوس نہیں کرتا، سو آ گیا ہوں۔ معاملہ کہاں تک پہنچا؟'' اس نے بعد والا جملہ عباس شاہین سے کہا۔

''معاملے کی بات مینجر صاحب اور حامد غوری صاحب کو کرنی تھی۔ ابھی تک آئے ہی نہیں۔'' عباس شاہین نے کہا۔

''لیکن سوال یہ ہے کہ وہ کیوں نہیں آئے۔'' ڈاکٹر شریف شیخ نے منہ بنا کر کہا۔

''ہم پہنچ گئے ہیں جناب۔'' پیچھے سے آواز آئی۔ انہوں نے دروازے کی طرف دیکھا تو دونوں چلے آ رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں بھی پستول تھے۔

''خدایا رحم، یہاں تو جو بھی آ رہا ہے، پستول لے کر آ رہا ہے۔'' فاروق نے بہت دیر بعد زبان کھولی۔

''تم لوگ معمولی آدمی تو نہیں ہو۔ یہ تم سے خوفزدہ ہیں۔'' انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

''یا خدا تیرا شکر ہے۔ کوئی تو ہم سے بھی خوفزدہ ہے۔'' فاروق نے کہا۔

''فاروق، پاگلوں جیسی باتیں نہ کرو۔'' محمود بولا۔

''اچھا، اب نہیں کروں گا۔'' اس نے سعادت مندانہ لہجے میں کہا۔

''سوال یہ ہے کہ تم دونوں لیٹ کیوں پہنچے؟ تمہیں تو مجھ سے پہلے پہنچ جانا چاہیے تھا۔ عباس شاہین کا فون ملنے کے فوراً بعد۔'' ڈاکٹر بولا۔

''ہمارا خیال ہے کہ ہمارے گھروں کی نگرانی ہو رہی ہے۔ ہم یہ اندازہ لگاتے ہوئے آئے ہیں کہ کہیں ہمارا تعاقب تو نہیں ہو رہا۔ جب یہ یقین ہو گیا کہ تعاقب نہیں ہو رہا تو اس وقت ہم یہاں داخل ہوئے ہیں۔'' حامد غوری نے کہا۔

''ہوں، خیر...... اب ہم معاملے کی طرف آتے ہیں۔ میرا خیال ہے، ہمیں اطمینان سے بیٹھ جانا چاہیے۔'' ڈاکٹر نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔''

''تو پھر آؤ، ہم میٹنگ روم میں چلتے ہیں۔''

''چلیے جناب انسپکٹر صاحب۔''

وہ نہایت اطمینان سے چلتے ہوئے کمرے سے باہر نکل آئے۔ اسی وقت انسپکٹر جمشید نے پھر گھڑی کی طرف دیکھا۔ پونے دو بج رہے تھے۔ گویا ابھی پندرہ منٹ باقی تھے۔ میٹنگ روم نسبتاً بڑا کمرہ تھا۔ یہاں ایک گول میز کے گرد کرسیاں بچھی تھیں۔

''ان لوگوں کی تلاشی تو اچھی طرح لی جا چکی ہے نا؟'' ڈاکٹر نے پوچھا۔

''جی ہاں، آپ فکر نہ کریں، یہ ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ یوں بھی میں نے یہاں ان کا پورا انتظام کر رکھا ہے۔ ہمارے دس بہترین ورکر بالکل تیار ہیں۔ ان کی طرف سے اگر ذرا بھی حرکت ہوئی تو وہ ان پر بھوکے کتوں کی طرح ٹوٹ پڑیں گے اور ان کی تکا بوٹی کر دیں گے۔''

''تکے کھانے کا شوق تو مجھے بھی بہت ہے۔ افسوس موقع ہی نہیں ملتا۔'' فاروق بول اٹھا۔

''فاروق تم باز نہیں رہو گے۔ فرزانہ نے اسے گھورا۔

''نہیں رہوں گا۔ صبح سے یہ وقت آ گیا ہے چپ رہتے ہوئے۔'' فاروق نے بھنا کر کہا۔

''بولنے دو بھئی، چہکنے دو، تمہارا کیا نقصان ہے۔'' انسپکٹر جمشید نے فرزانہ کو آنکھوں میں اشارہ کیا کہ فاروق کا کچھ نہ کچھ بولتے رہنا فائدہ مند ہے۔ کیونکہ بعض اوقات اس کی باتیں مجرموں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا کرتی تھیں اور انہیں کوئی موقع ہاتھ آ جایا کرتا تھا۔ اسی وقت ڈاکٹر کی آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی۔

''حامد غوری، ذرا جلدی معاملے کی بات کرو۔ مجھے واپس بھی جانا ہے۔''

''جی بہتر۔'' یہ کہہ کر حامد غوری انسپکٹر جمشید کی طرف مڑا، اور بولا:

''انسپکٹر صاحب، آپ ہمارے کاروبار کے بارے میں اندازہ لگا ہی چکے ہیں۔ اب اگر ہم آپ کو یہاں سے جانے دیتے ہیں تو آپ ہمیں نہیں چھوڑیں گے، ہم سب کو گرفتار کرا دیں گے اور ہم ساری زندگی جیل میں سڑتے رہیں گے۔ ظاہر ہے کہ شریف لوگ جیلوں میں زندگی گزارنا پسند نہیں کرتے؛ لہٰذا دو ہی صورتیں ہیں یا تو ہم آپ پانچوں کا تیا پانچا کر دیں یا آپ ہماری ایک بات مان لیں، کیونکہ ہم انسانی خون سے ہاتھ نہیں رنگنا چاہتے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہم قتل کے کیس میں پولیس کارروائیوں کے جھنجھٹ میں نہیں پڑنا چاہتے۔ اس کی صرف یہی صورت ہے کہ آپ لوگ ہماری بات مان لیں۔'' یہاں تک کہہ کر حامد غوری خاموش ہو گیا۔

''میں سن رہا ہوں۔ بات جاری رکھیے۔'' انسپکٹر جمشید بولے۔

''ہمارا خیال ہے کہ آپ ایک کروڑ روپیہ ہم سے لے لیں اور بدلے میں ہمارے بارے میں خاموش رہیں۔ باہر نکل کر آپ کہہ دیں کہ جاوا اینڈ کو پر شک بلا وجہ تھا۔ وہاں ایسی کوئی بات نہیں بیگم صاحبہ پہاڑ کے پاس ہی کہیں سے مل جائیں گی۔ یہ بیان دے سکتی ہیں کہ ایک کھوہ میں گر کر بے ہوش ہو گئی تھیں، اس کے بعد اب ہوش آیا

ہے۔" حامد غوری ایک بار پھر خاموش ہو گیا۔

"بس یا کچھ اور بھی؟" انسپکٹر جمشید مذاق اڑانے والے لہجے میں بولے۔

"اگر ایک کروڑ روپے کی رقم کم لگی ہے، تو اس میں اضافہ بھی کیا جا سکتا ہے۔"

"تھوڑی دیر پہلے میں اپنی بیگم سے یہ کہہ رہا تھا کہ انہیں سچ بولنے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ کہہ سکتی تھیں کہ انہوں نے کچھ نہیں سنا۔ اب تم لوگوں نے مجھے بھی اسی مقام پر لا کھڑا کیا۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ میں تم سے ایک روڑ روپیہ لینا منظور کر لوں اور باہر جا کر تمہاری کمپنی کو گھیرے میں لینے کے احکام صادر کر دوں، لیکن میں ایسا نہیں کروں گا۔ میں ایک لمحے کے لیے بھی اپنی پیشانی پر رشوت کا داغ نہیں لینا چاہتا۔ مجھے تمہاری یہ شرط منظور نہیں۔"

"دوسری صورت میں ہمیں قتل جیسے سنگین جرم کا ارتکاب کرنا پڑے گا۔" حامد غوری نے سخت لہجے میں کہا۔

"پروا نہیں، قتل کر کے تم بچ نہیں سکو گے۔ ہمارا خون ضرور رنگ لائے گا اور تم سب پکڑے جاؤ گے۔ یہی ہمارا مقصد ہے۔ مقصد اگر مر کر بھی حاصل ہو جائے تو یہ سودا مہنگا نہیں۔"

"اچھی بات ہے تمہاری..."

اسی وقت بھاری قدموں کی آواز گونج اٹھی۔ پھر ایک شخص سٹین گن لیے اندر داخل ہوا۔ اس نے کہا:

"جناب، پولیس کمپنی کو گھیرے میں لے رہی ہے۔"

"اوہ، تو یہ لوگ باقاعدہ پروگرام بنا کر آئے ہیں۔" ڈاکٹر کے منہ سے نکلا۔

"اب بھی وقت ہے ڈاکٹر، خود کو قانون کے حوالے کر دو۔" انسپکٹر جمشید نے گویا اسے مشورہ دیا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" اس نے کہا، پھر وہ آنے والے کی طرف مڑا:

"چھت پر چاروں طرف پھیل جاؤ۔ پہلے میں پولیس سے بات کروں گا۔ اگر کوئی فیصلہ نہ ہو سکا، تو میں تمہیں اشارہ کروں گا۔ اس وقت تم فائرنگ شروع کر سکتے ہو۔"

"مگر اس کا فائدہ کیا ہو گا جناب۔" عباس شاہین بولا۔

"فائدہ، تو کیا تم چاہتے ہو کہ ہم خود کو پولیس کے حوالے کر دیں۔"

"اب ہم کر ہی کیا سکتے ہیں۔ ان لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار کر ہم دوہرے جرم کے مجرم بن جائیں گے۔ خود کو قانون کے حوالے کرنے کی صورت میں تو ہم پر صرف جعلی دواؤں کی فروخت کا مقدمہ ہی چلے گا اور ہمیں جیل کی سزا دی جا سکے گی۔ دوسری صورت میں پھانسی کی سزا سے کم سزا نہیں ملے گی۔"

ڈاکٹر شریف شیخ سوچ میں گم ہو گیا، پھر اچانک بولا:

"تم بے وقوف ہو۔"

"جی، اگر آپ کا یہ خیال ہے تو میں واقعی بے وقوف ہوں گا، لیکن ذرا وضاحت کر دیجیے کہ کس طرح؟" عباس شاہین نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

"سنو، اس منزل کے بارے میں کسی کو علم نہیں ہے۔ اگر ہم انہیں اس منزل کے ایک کمرے میں بند کر کے خونی دھواں اندر چھوڑ دیں اور اوپر جا کر پولیس کے لیے دروازہ کھول دیں تو وہ ہمارے خلاف بھلا کیا ثابت کر سکے گی۔ جعلی دواؤں کے بارے میں ابھی صرف ان لوگوں کو معلوم ہے۔"

"ویری گڈ، واقعی میں بے وقوف ہوں۔" عباس شاہین نے خوش ہو کر کہا۔

ایک ساتھ ان پر کئی پستول تن گئے۔ اس وقت اگر بیگم جمشید ان کے ساتھ نہ ہوتیں، تو وہ ضرور کچھ نہ کچھ کر گزرتے۔ لیکن ان کی موجودگی میں فائرنگ کا ہونا کچھ

مناسب نہیں تھا۔

"ہاتھ اوپر اٹھا دو اور کمرے سے نکلو۔"

"وہ کمرے سے نکل آئے۔ ایک بار پھر انہیں اسی کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ جس میں انہوں نے خود کو بے ہوش پایا تھا۔

سامنے دیوار سے لگ کر کھڑے ہو جاؤ۔" ڈاکٹر نے سرد آواز میں کہا۔

اس لمحے انہوں نے خود کو بے بس محسوس کی اور سوچا کہ وہ کچھ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں، پھر جوں ہی وہ دیوار سے جا کر لگے، دروازہ بند کر دیا گیا اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے سفید دھوئیں کی پتلی سی لکیر ایک سوراخ سے اندر آتے دیکھی۔ سوراخ کمرے کی دیوار میں چھت کے قریب تھا۔

☆☆

جاوا اینڈ کو کی عمارت کو گھیرے میں لینے کے بعد سب انسپکٹر اکرام نے چوکیدار سے کہا۔

"اندر اگر کوئی ذمے دار آدمی موجود ہے تو اسے باہر بلایا جائے صرف دو منٹ دیے جاتے ہیں۔ اس کے بعد ہم اندر گھس کر تلاشی لینے پر مجبور ہو جائیں گے۔"

"بہت اچھا جناب، میں اندر جا کر آپ کا پیغام دیتا ہوں۔" چوکیدار نے کہا اور گیٹ بند کر کے اندر چلا گیا۔ جلد ہی عباس شاہین اس کے ساتھ باہر آیا اور سب انسپکٹر اکرام اور کانسٹیبلوں پر ایک نظر ڈالتے ہوئے بولا:

"کیا بات ہے جناب، ہماری کمپنی کی عمارت کو گھیرے میں کیوں لیا گیا ہے؟"

"اندر انسپکٹر جمشید، ان کے بچے اور بیوی موجود ہیں ہمیں ان کے پاس لے جایا جائے۔"

"آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے جناب، بھلا ان کا یہاں کیا کام؟"

"تو آپ کے خیال میں وہ اندر نہیں ہیں۔" اکرام نے تیز آواز میں کہا۔

"جی نہیں۔" عباس شاہین لاپروائی سے بولا:

"اگر وہ لوگ اندر نہیں ہیں تو ہمیں تلاشی لینے کی اجازت دی جائے۔ کیونکہ وہ سوا بارہ بجے کے قریب دفتر سے یہی اندراج کر کے چلے تھے کہ جاوا اینڈ کو جا رہے ہیں۔ انہوں نے ہدایت کی تھی اگر وہ دو بجے تک نہ لوٹیں تو کمپنی کی تلاشی لی جائے اور اس وقت دو بج کر کچھ منٹ ہو چلے ہیں۔"

"کیا آپ کے پاس تلاشی کے وارنٹ ہیں۔"

"بالکل ہیں، یہ دیکھیے۔"

عباس شاہین نے تلاشی کے وارنٹ بغور دیکھے اور پھر بولا:

"ٹھیک ہے۔ آپ شوق سے تلاشی لے سکتے ہیں۔"

اکرام نے کانسٹیبلوں کی اچھی خاصی تعداد باہر متعین کی تھی۔ وہ جوں کے توں اپنی جگہ پر موجود رہے۔ بقیہ کانسٹیبلوں کو ساتھ لے وہ اندر داخل ہوا۔ تینوں منزلوں کے ایک ایک کمرے کی اچھی طرح تلاشی لی گئی، لیکن انسپکٹر جمشید اور ان کے بیوی بچوں کا کوئی سراغ نہ ملا۔ اب تو اکرام بہت پریشان ہوا۔ اس نے ایک بار پھر نہایت باریک بینی سے تلاشی لینا شروع کی۔ عباس شاہین اس کے ساتھ ساتھ تھا اور بار بار کہہ رہا تھا:

"میں نے کہا تھا نا جناب، انسپکٹر صاحب اور ان کے بچے یہاں نہیں ہیں۔"

"لیکن تم لوگ رات کے وقت یہاں کیا کر رہے ہو؟" ایک بار اکرام نے جھلا کر پوچھا۔

"ہم اکثر رات کو بھی کام کرتے ہیں۔ ہماری کمپنی میں کام بڑھ گیا ہے، لہٰذا کبھی کبھی آرڈرز کی تعمیل کے سلسلے میں ہمیں رات کو بھی کام کرنا پڑتا ہے۔"

"ہوں۔ خیر، آپ ذرا خاموش رہیں اور ہمیں اپنا کام کرنے دیں۔" اکرام نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

دوسری مرتبہ بھی اکرام اور اس کے ساتھیوں کو کوئی سراغ نہ ملا۔ اکرام بہت حیران تھا۔ اسے یقین تھا کہ انسپکٹر جمشید اور ان کے بچے عمارت میں ہی کہیں موجود ہیں۔ لیکن کہاں، یہ اُسے معلوم نہیں تھا اور نہ معلوم کر سکا تھا۔ جھلاہٹ میں اس نے پیٹیاں ادھر ادھر کرا کے اور روئی کی گانٹھوں کو بھی الٹ پلٹ کرا کے دیکھا، لیکن اس طرح بھی کوئی کام نہ بنا۔ اب عباس شاہین کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ رینگنے لگی۔ اکرام کو غصہ آنے لگا۔ آخر اس نے تیسری بار تلاشی لی اور پھر بالکل مایوس ہو گیا۔ اس نے سوچا۔ وہ بھی رات کی تاریکی میں چوروں کی طرح عمارت کے اندر داخل ہوگا اور انہیں تلاش کرے گا، یہ فیصلہ کر کے اس نے واپسی کا ارادہ کر لیا۔ وہ اپنے کانسٹیبلوں کو لے کر دفتر والے کمرے میں آیا۔ یہاں منیجر اور جان باز کے علاوہ حامد غوری بھی موجود تھے۔ لیکن ان کے چہرے قدرے بدلے ہوئے تھے؛ گویا انہوں نے ہلکے قسم کا میک اپ کر لیا تھا۔ اکرام نے ان سے کہا:

"مجھے افسوس ہے۔ ہماری وجہ سے آپ سب کو زحمت ہوئی، امید ہے، آپ محسوس نہیں کریں گے۔"

"کوئی بات نہیں جناب، ہمارا فرض تھا کہ قانون کی مدد کریں۔" منیجر نے کہا۔

اکرام مڑا اور کمرے سے نکلنے لگا، لیکن اسی وقت ایک آواز نے ان کے قدم روک لیے۔

☆☆☆

طوفان کی لپیٹ میں

"کیوں اکرام، مایوس ہو کر واپس جا رہے ہو؟"

اور یہ جملہ کہا تھا انسپکٹر جمشید نے اکرام کو تو یوں لگا، جیسے سوکھے دھانوں میں پانی پڑ گیا ہو۔ وہ اور اس کے ساتھی چونک کر مڑے۔ انہوں نے دیکھا منیجر کی کرسی کے عین پیچھے دیوار میں ایک دروازہ نمودار ہو چکا تھا اور اس دروازے میں انسپکٹر جمشید کھڑے مسکرا رہے تھے۔ ان کے پیچھے انہیں بیگم جمشید بھی نظر آئیں۔ اکرام اور اس کے ساتھیوں کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اکرام کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"سر، یہ آپ ہیں اور بیگم صاحبہ بھی۔"

"ہاں اکرام، اس کو خدا کی قدرت کہتے ہیں۔ یہ لوگ تو اپنی جانب سے ہمیں ختم کر آئے تھے۔" یہ کہہ کر انہوں نے مختصر الفاظ میں انہیں بتایا کہ اس کمپنی میں کیا ہو رہا ہے۔ پھر انہوں نے بتایا کہ وہ کس طرح نیچے ایک کمرے میں بند کر دیے گئے تھے اور خونی دھواں ایک سوراخ کے ذریعے کمرے میں آنے لگا تھا۔

"اور دھوئیں کی لکیر دیکھتے ہی ہم نے اپنے سانس روک لیے۔ میں کمرے میں پڑی میز پر چڑھ گیا۔ محمود کو اپنے کندھے پر چڑھا لیا اور اس طرح اس کا ہاتھ اس سوراخ تک پہنچ گیا۔ اس نے سوراخ ہاتھ کی انگلی سے بند کر دیا۔ ادھر فاروق اور

فرزانہ دروازہ کھولنے کی کوشش میں لگے تھے۔ انہوں نے اس کام کے لیے محمود کے جوتے کی ایڑی میں سے چاقو نکال لیا تھا۔ محمود کو میرے کندھوں پر چڑھنے کے لیے جوتے اتارنے پڑے تھے، انہوں نے چاقو کی مدد سے چٹخنی کے آس پاس کی لکڑی کو کاٹنا شروع کر دیا آخر وہ کامیاب ہو گئے۔ انہوں نے دروازہ کھول لیا۔ ہم کمرے سے نکل آئے اور دروازہ بند کر دیا۔ ہم موت کے منہ سے نکل آئے تھے، لیکن ابھی ہمیں خفیہ دروازے کو تلاش کرنا تھا۔ پانچوں خفیہ دروازے کی تلاش میں جٹ گئے۔ اور اکرام، تمہیں یہ سن کر بہت حیرت ہوگی کہ دروازہ بیگم نے تلاش کیا۔ آتشدان کے نیچے انہیں چمنی کے ساتھ ایک لوہے کی زنجیر لٹکتی نظر آئی۔ انہوں نے زنجیر کو کھینچ ڈالا۔ بس پھر کیا تھا، ایک دروازہ نمودار ہوا۔ ہم اس میں داخل ہوئے اور سیڑھیاں چڑھتے ہوئے یہاں پہنچ گئے۔ آخری سیڑھی پر بھی ہمیں ویسی ہی ایک زنجیر نظر آئی۔ میں نے اسے کھولا تو دروازہ کھل گیا۔ اور تم پر ہماری نظر پڑی۔ تم دروازے سے نکلنے کی تیاری کر رہے تھے۔ یہ تھی کل کہانی۔"

یہاں تک کہہ کر انسپکٹر جمشید خاموش ہو گئے۔ کمرے میں موت کی سی خاموشی چھا گئی۔ پھر فرزانہ نے کہا۔

"لیکن ابا جان، وہ آدمی کہاں گئے جو انہوں نے ہمارا انتظام کرنے کے لیے مقرر کر رکھے تھے۔"

"شاید وہ گیدڑ بھبکی تھی؛ تاہم ہم ابھی تینوں منزلوں کی اور خفیہ دروازوں کی تلاشی لیں گے۔ تمام جعلی ادویات قبضے میں لیں گے۔ اکرام، پولیس اور آفیسروں کو فون کر کے بلا لو۔ اس کمپنی کی بنیادوں تک کو کھود کر تلاشی لی جائے گی۔"

"جی بہتر۔" اس نے کہا اور فون کا ریسیور اٹھا کر نمبر گھمانے لگا۔ ڈاکٹر شریف شیخ، عباس شاہین، منیجر، حامد غوری اور جانباز خان کے چہرے سفید پڑ چکے تھے۔ اور

یوں لگتا تھا جیسے اب وہ کبھی منہ سے کوئی لفظ نہ نکال سکیں گے۔

دوسری صبح وہ ناشتا کر رہے تھے۔ پانچوں بہت خوش تھے۔ وہ بیگم جمشید کو بتا رہے تھے کہ انہوں نے انہیں کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا۔

"اب کیا خیال ہے امی جان، آپ آئندہ ہمارے ساتھ پہاڑ پر چلا کریں گی یا نہیں۔" فرزانہ کہہ رہی تھی۔

"بھئی ان سے یہ سوال نہ کرو بلکہ مجھ سے پوچھو۔"

"آپ سے، کیا مطلب؟" فرزانہ چونکی۔

"مطلب یہ کہ یہ سوال مجھ سے پوچھو کہ آئندہ انہیں ساتھ لے کر جایا کریں گے نہیں، تو میرا جواب یہ ہے، میں انہیں کبھی پہاڑ پر چلنے کے لیے مجبور نہیں کروں گا۔" انہوں نے کہا۔

"لیکن کیوں ابا جان، ان کے پہاڑ پر جانے سے بھلا کیا نقصان ہوا ہے۔ آپ دیکھے تو سہی، امی جان کو ایک خراش تک نہیں آئی ہاں یہ ضرور ہے کہ یہ وقتی طور پر بے ہوش ہو گئی تھیں۔ بدلے میں ایک اتنا بڑا جرائم پیشہ گروہ گرفتار ہو گیا ہے۔"

"تو کیا اب تم یہ چاہتے ہو کہ یہ ہر بار ہمارے ساتھ پہاڑ پر جایا کریں، ہر بار گرا کریں اور ہر بار ایک گروہ ان کے گرنے کی وجہ سے گرفتار ہوا کرے۔" انسپکٹر جمشید حیران ہو کر بولے۔

"جی خیر، یہ تو ہم نہیں چاہتے۔" فاروق نے معصومانہ انداز میں کہا۔

"میرا خیال ہے، آپ انہیں یہ سوال مجھ سے ہی پوچھ لینے دیں۔"

"چلو، پھر تم ہی جواب دے دو۔" انہوں نے کہا۔

"اب آپ جب بھی پہاڑ پر جانے کا پروگرام بنایا کریں گے، میں خوشی سے آپ کے ساتھ چلا کروں گی، کیونکہ میرے ایک بار جانے سے ملک اور قوم کو بے

تحاشا فائدہ پہنچا ہے۔ اس طرح کم از کم اس واقعے کی یاد ہی تازہ ہو جایا کرے گی۔'' انہوں نے کہا۔

''بہت خوب، بہت شاندار۔'' انسپکٹر جمشید نے تالی بجادی۔

اسی وقت دروازے کی گھنٹی بجی۔ انہوں نے ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''انکل خان رحمان تو یہاں ہیں نہیں، پروفیسر انکل بھی نہیں ہیں، پھر یہ کون آ گیا ہمیں مبارک باد دینے۔'' محمود نے حیران ہو کر کہا۔

''کوئی تو اللہ کا بندہ ہو گا ہی، اس نے سوچا ہو گا، آج ان بے چاروں کو مبارک باد دینے والا کوئی نہیں۔ چلو چل کر میں ہی مبارک باد دے آؤں۔'' فاروق نے کہا اور مسکرانے لگے۔

''بھئی، پہلے دروازے پر جا کر دیکھ تو لو۔ خیالی گھوڑے بعد میں دوڑاتے رہنا۔'' بیگم جمشید مسکرائیں۔

''جہاں تک میرا خیال ہے، یہ بیگم شیرازی بھی نہیں ہیں۔ کیوں ٹھیک ہے نا۔'' فرزانہ نے محمود اور فاروق کی طرف تصدیق طلب نظروں سے دیکھا۔

''میرا خیال ہے، دروازہ مجھے ہی کھولنا پڑے گا۔'' انسپکٹر جمشید نے بھنا کر کہا۔

''نہیں نہیں ابا جان، آپ کیوں تکلیف کرتے ہیں۔ یہ تکلیف کرنے کے لیے محمود جو ہے۔'' فاروق نے شوخ آواز میں کہا۔

''دھت تیرے کی۔'' محمود نے کہا اور اٹھ کر دروازے کی طرف چلا گیا۔

''اس کی دھت تیرے کی سے نہ جانے کب نجات ملے گی۔'' فرزانہ بولی۔

''کیوں، کیا لیتی ہے تم سے دھت تیرے کی۔'' بیگم جمشید نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔

''جی، لیتی دیتی تو کچھ بھی نہیں۔ موقع بے موقع ٹپک تو پڑتی ہے۔'' فاروق نے جواب دیا۔

اسی وقت محمود حیران پریشان سا آتا دکھائی دیا۔ یہ دیکھ کر فاروق نے کہا۔

''خدا خیر کرے، آنے والے ضرور کچھ نئے لوگ ہیں۔''

''ابا جان، باہر بہت سے لوگ موجود ہیں اور آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔''

''تم نے پوچھا نہیں، کون لوگ ہیں اور کیوں ملنا چاہتے ہیں۔''

''جی نہیں، اس لیے کہ وہ کیمرے پھولوں اور نوٹوں کے بے تحاشا ہار لیے کھڑے ہیں۔''

ارے باپ رے، کہیں یہ اخباری رپورٹر تو نہیں۔''

''جی نہیں۔ اخباری رپورٹر ہوتے تو ہار کیوں لے کر آتے۔''

''ہاں، یہ بھی ٹھیک ہے۔ خیر، انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ۔''

جوں ہی انسپکٹر جمشید، بیگم جمشید اور تینوں بچے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے، ان کے گلوں میں دھڑا دھڑ ہار ڈالے جانے لگے۔ انسپکٹر جمشید نے پریشان ہو کر کہا:

''ارے بھئی، یہ سب ہے کیا۔ آپ لوگ آخر ہیں کون، پہلے اپنا تعارف تو کرائیے۔''

''جناب، ہم ادویات کی مختلف کمپنیوں کے مالکان ہیں۔ آپ نے جو کارنامہ انجام دیا ہے۔ پولیس کے ذریعے ہمیں اس کی خبر ہو گئی ہے، لہٰذا ہم آپ کا شکریہ ادا کرنے اور مبارک باد دینے کے لیے یہاں دوڑے آئے۔ آپ نے نہ صرف ہم سب پر بلکہ پوری قوم پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔'' ان میں سے ایک نے وضاحت کی۔

''دیکھیے جناب، آپ کا خیال بالکل غلط ہے، ہم نے ایسا کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا۔'' انسپکٹر جمشید بولے۔

''جی، یہ آپ کیا فرما رہے ہیں۔ پولیس کے بڑے بڑے افسران نے اس واقعے کی تصدیق کر دی ہے۔ان میں سے ایک اور حیران ہو کر بولا۔

''بات دراصل یہ ہے جناب کہ اس واقعے میں ہماری کوشش کو ایک فی صد بھی دخل نہیں ہے، یہ تو اللہ کی مرضی تھی۔ وہ ان قوم کے دشمنوں کو گرفتار دیکھنا چاہتا تھا۔ ہوا صرف یہ تھا کہ ہم پہاڑ کی سیر کے لیے گئے تھے۔ بیگم لڑھک کر نیچے جا پڑیں۔ یہ اتفاق سے جاوا اینڈ کو کے ٹرک پر گریں اور ہم ان کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے یہ تلاش ہمیں دراصل جاوا اینڈ کو تک لے گئی تھی۔''

''کچھ بھی ہو، بہر حال اس کا سہرا تو آپ لوگوں کے سر ہی بندھے گا۔''

''ارے باپ رے، پھر وہی سہرا۔'' فاروق نے بوکھلا کر کہا۔

''بھئی کیوں گھبراتے ہو، اپنے حصے کا سہرا میرے ماتھے پر سجا دینا۔'' محمود نے کہا۔سب نے اس کی بات پر قہقہہ لگایا۔

''مہمانوں نے ان کی کئی تصاویر لیں، پھر انسپکٹر جمشید بولے:

''بیگم، کیا مہمانوں کو چائے نہیں پلاؤ گی۔''

''ضرور، کیوں نہیں۔'' انہوں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''آپ زحمت نہ کریں، ہم سب کچھ ساتھ لے کر آئے ہیں۔'' اور واقعی وہ کھانے پینے کی بے شمار چیزیں بھی ساتھ لائے تھے۔ خوب جشن رہا۔ ایسے میں ایک کمپنی کے مالک نے کہا:

''ہم بھی حیران تھے کہ یہ ہماری کمپنیوں کی دواؤں کو ہو کیا گیا ہے۔ یہ دھڑا دھڑ ناکام کیوں ہو رہی ہیں۔ سیل کیوں رکتی جا رہی ہے۔ اب ہمیں کیا معلوم تھا کہ یہاں کچھ چھپے رستم بھی موجود ہیں۔''

''خدا کا شکر ہے، یہ چکر ختم ہوا۔ اب کل کے اخبارات اس واقعے کی تفاصیل

شائع کریں گے۔ آج کے اخبارات نے تو بہت مختصر خبر لگائی ہے۔ دراصل گروہ کی گرفتاری رات کے دو بجے عمل میں آئی اور اس وقت تک اخبارات کے اصل صفحات شائع ہو چکے تھے، اصل شور تو کل کے اخبارات میں مچے گا۔''

''جی ہاں، اور پھر آئے گی ہماری شامت۔'' فاروق نے مسمسی صورت بنا کر کہا۔

''جی شامت، کیا مطلب؟''

''بات یہ ہے جناب، کہ شامت کا مطلب تو شامت ہی ہوتا ہے۔ ویسے وضاحت اس کی یہ کہ پھر آئے گا طوفان ہمیں مبارکباد دینے والوں کا۔ آپ تو فرصت میں چلے آئے اور کل تو ہمارے انکل بھی آ جائیں گے۔ اوہو، ان کے استقبال کے لیے تو ہمیں ابھی سے تیار ہو جانا چاہیے۔'' فاروق نے کہا۔

اور سب مسکرانے لگے۔